ماہنامہ مجلہ

حیاتِ نَو

بلریاگنج

APRIL 1987

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ مجلہ

حیات نو

جلد ۳ شمارہ ۴

اپریل ۱۹۸۷ء

مدیر منتظم نور محمد فلاحی

مدیر طارق فارقلیط فلاحی

○ مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ ○

●

قیمت فی شمارہ	۳ روپے
سالانہ تعاون	۳۰ روپے
خصوصی تعاون	۱۰۰ روپے
غیر ممالک سے	۱۵ امریکی ڈالر

ترسیل زر کا پتہ

دفتر مجلہ حیات نو، بلریا گنج اعظم گڈھ، یوپی

کتبہ عبدالرحیم اعظمی ۲۷٦۱۲۱ نشاط آفسٹ پریس ٹانڈہ

نقوش حیات نو

		صفحہ نمبر
اداریہ		
"ذالک الکتاب"	ایڈیٹر	۳
انٹرویو		
جمہوری انقلاب جمہوریت کے ذریعہ برپا کیا جا سکتا ہے	محمد صلاح الدین پاکستان	۷
بحث ونظر		
قائد۔ تحریک اسلامی کے ستونوں میں سے ایک اہم ستون، ایک فکر انگیز تحریر	اسرار عالم دہلی اسسٹنٹ ایڈیٹر ریڈینس	۲۰
عظمت کے مینار		
حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمیؓ	ابو جاوید استاذ جامعہ	۳۳
گوشہ ادب		
رشید احمد صدیقی (مضامین رشید کے آئینہ میں)	صاحب علی خاں	۴۰
سوال وجواب		
ایک طالب حق کے خط کا جواب	مولانا سید حامد علی	۴۹
شعر ونغمہ		
غزلیں۔	عزیز بگھروی۔ عزیز الدین عزیز	۵۵
تعارف وتبصرہ		
علامہ سید سلیمان ندویؒ شخصیت وخدمات	عبید اللہ فہد فلاحی	۵۶
حلقہ یاراں		
ظفر الاسلام۔	تابش مہدی	۵۷
جامعہ کے لیل ونہار	ادارہ	۵۹

اداریہ

"ذالک الکتاب"

کتاب کا لفظ عام ہے اس کو آپ کسی بھی کتاب کے لئے استعمال کر سکتے ہیں لیکن جب اس لفظ پر ال داخل ہو جائے تو یہ لفظ خاص ہو جاتا ہے اور اس سے مراد کوئی خاص کتاب ہوتی ہے۔ یہاں قرآن مراد ہے۔ یہ لفظ سورۃ بقرہ کی ابتدائی آیت سے ماخوذ ہے۔ مولانا جلیل احسن ندوی نے ان دو الفاظ میں بڑی جان ڈال دی ہے۔ آپؒ فرماتے ہیں ذالک۔ الکتاب۔ وہی کتاب ہے۔ ای ذالک الکتاب الموعود المبشر الکامل ھو ھذا الکتاب۔ وہ کتاب جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا وہ یہی کتاب ہے۔ جو محمد ابن عبد اللہ پر نازل ہوئی۔ پس منظر کی مزید وضاحت ان الفاظ سے ہوتی ہے "مخاطب اہل کتاب ہیں بالخصوص یہود، ان کو ایمان کی دعوت دی جا رہی ہے اور ان کا حال یہ ہے کہ ان کی کتاب میں پیشین گوئی کی گئی ہے کہ ایک شخص آتشیں شریعت لے کر آئے گا جو اس سے ٹکرائے گا پاش پاش ہو جائے گا۔"

قرآن ایک کتاب ہدایت ہے جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ۲۳ سال کی طویل مدت میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا جاتا رہا۔ قرآن کا مطالعہ کرنے سے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی سپریم پاور ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت و رہنمائی میں چلنے والی تحریک کی مسلسل نگرانی کر رہا ہے اور اس کے لئے موقع بموقع ضروری ہدایتیں، اصول وضوابط اور قوانین بھیج رہا ہے۔ وہ سپریم پاور خدا کی ذات ہے اور حضرت جبرئیل کے ذریعہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کو نازل کرتا رہا ہے۔

قرآن مجید خدا کا کلام ہے جو ہماری ہدایت و رہنمائی کے لئے نازل ہوا۔ جب تک خدا کی اس مضبوط رسی کو ہم تھامے رہے دونوں جہان میں سرخرو رہے اور جس وقت تک پکڑے رہیں گے سرخرو رہیں گے، قرآن و حدیث ہی دو بنیادی سرچشمے ہیں جہاں سے ہم کو ہدایت و رہنمائی مل سکتی ہے اور یہی اسلام کی اساس اور دین کے بنیادی ماخذ ہیں۔ میرے ذہن میں یہ سوال بار بار آتا ہے کہ ہماری زبوں حالی کا راز کیا ہے؟ اور کہاں ہے؟ ہم کیوں ذلیل ہیں؟ پست ہمت ہیں؟ ہماری اخلاقی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی مسائل کیوں ختم نہیں ہوتے؟ ہم کیوں انتشار سے ... ؟ کیوں ہمارے دل ایک دوسرے سے

دور، بچھڑے ہوئے اور منتشر ہیں؟ کیا ہم متحد اور متفق نہیں ہو سکتے؟ کیا ہم ایک دوسرے کے قریب نہیں آسکتے؟ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ ہم نے جس طرح سے سوچا، جس زاویے سے غور کیا اور جس وقت غور کیا جواب ایک ہی ملا — اور بہت ہی واضح اور دو ٹوک انداز میں ملا — تم قرآن سے دور ہو گئے، تم قرآن چھوڑ بیٹھے، تم نے قرآن کو بھلا دیا —

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر ☆ اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

اور اب میں موجودہ حقائق کی روشنی میں غور کرتا ہوں تو بات اور واضح ہو جاتی ہے۔ یقیناً ہماری زندگی قرآنی تعلیمات سے خالی ہو گئی ہے۔ ہماری انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی زندگی، معاشرتی ہو یا معاشی، سیاسی ہو یا علاقی ہر جگہ ہم نے قرآن کو نظر انداز کیا اور اس طرح نظر انداز کیا کہ وہ عربی مدارس جو دین کی تفہیم و تعلیم کے لئے قائم ہوئے وہاں بھی دین کے سب سے بڑے ماخذ، سب سے بنیادی ماخذ اور سب سے سچے اور حقیقی ماخذ کی مکمل تعلیم نہیں ہوتی۔ بعض مدارس میں کچھ منتخب سورتیں پڑھائی جاتی ہیں، اور بعض میں کچھ منتخب تفسیریں۔ ہاں کچھ ایسے مدارس بھی ہیں جن کے کورس میں پورا قرآن شامل ہے مگر شاید ہی طلبہ کا کوئی خوش قسمت گروپ رہا ہو جس نے پورا قرآن ختم کیا ہو اور شاید ہی کوئی اچھا سال رہا ہو جس میں کورس پورا ہوا ہو، اور اب تو یہ مدارس بھی تعلیمی حیثیت سے حالات کے شکار ہوتے جا رہے ہیں۔ اب نہ صرف ان مدارس میں بلکہ پورے ہندوستان میں ایسے لوگوں کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی ہے جنہوں نے قرآن کو پڑھنے، سمجھنے اور غور کرنے میں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ لگایا ہو اور انہوں نے اس بحر سے کچھ حاصل بھی کیا ہو۔ یقیناً ملتِ اسلامیہ کے لئے اور خصوصاً ملتِ اسلامیہ ہند کے لئے ایک بڑی ٹریجڈی ہے۔

قرآن اور رمضان میں بہت گہرا تعلق ہے — "شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ" رمضان کے مہینے میں قرآن نازل ہونا شروع ہوا — رمضان کے مبارک مہینہ میں حضرت جبرئیلؑ تشریف لاتے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی معیت میں قرآن مکمل کرتے۔ کسی کسی رمضان میں آپ دو، دو بار قرآن ختم کرتے۔ اور پھر پوری دنیا میں رمضان کے مہینے میں قراء اور حفاظ لاکھوں، کروڑوں بار تراویح میں بھی اور تراویح سے باہر بھی قرآن ختم کرتے ہیں۔ گویا رمضان قرآن کا مہینہ ہے — اور اب ایک اور رمضان انتہائی تیزی کے ساتھ اپنے دامن میں یمن و سعادت لئے

آ رہا ہے۔ کیوں نہ اس رمضان کو ایک اور طرح منائیں — جو لوگ عربی زبان جانتے ہیں اور قرآن کے طالبِ علم ہیں وہ رمضان میں کسی نہ کسی سورۃ کو منتخب کریں اور اس پر غور و فکر کریں، معنی اور مطالب کو سمجھیں اور اس بحر میں ڈوبنے کی کوشش کریں۔ پہلے مشکل الفاظ کو نوٹ کر لیں۔ پھر لغت کی طرف رجوع کریں۔ لسان العرب، اقرب الموارد اور المنجد وغیرہ سے مدد لے سکتے ہیں۔ پھر سورۃ کے نزول کے پس منظر، آیات کے سیاق و سباق اور سورۃ کے مرکزی موضوع و مضمون کو سامنے رکھتے ہوئے مفہوم متعین کریں۔ اس مرحلے میں عربی تفاسیر اور نحو نیز کلامِ عرب سے مدد لے سکتے ہیں۔ انشاء اللہ یہ مطالعہ ٹھوس ہوگا اور قرآن کو سمجھنے میں مفید اور معاون ثابت ہوگا۔ جو لوگ عربی نہیں جانتے وہ قرآن کا مطالعہ کرنے کے لئے تین تفاسیر اپنے سامنے رکھیں اور قرآن کا مطالعہ تینوں تفاسیر کی مدد سے ایک ساتھ کریں۔ انشاء اللہ قرآن کے مختلف پہلو سامنے آئیں گے۔ ایک تفسیر ہے، تفہیم القرآن۔ مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے اردوئے مبین میں قرآن کی دعوت اور تحریکِ اسلامی کے مزاج و منشا کو واقعات و حالات کی روشنی میں پیش کیا ہے، یہ تفسیر پڑھنے والے کی زندگی میں انقلاب پیدا کرتی ہے اور قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا قرآن اس کے ضمیر پر نازل ہو رہا ہے اور خدا خود اس کی ذات سے مخاطب ہے۔

دوسری تفسیر تدبرِ قرآن ہے۔ یہ علمی و ادبی نوعیت کی ایک تفسیر ہے جس میں الفاظ کی تشریح جملوں کی وضاحت، آیتوں کا باہمی ربط اور سورۃ کے مرکزی مضمون سے اس کا تعلق بتایا گیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے علم میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوتی ہے۔

تیسری تفسیر بیان القرآن ہے۔ جو قرآن فہمی میں بہت مفید اور معاون ہے۔ اور اگر توفیق ملے تو مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کی تفسیر معارف القرآن پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ اس میں کچھ ضروری مسائل بھی آ گئے ہیں۔

بدقسمتی سے ہمارے اندر عوام کا ایک ایسا طبقہ ابھر رہا ہے جس کے دل میں یہ بات بٹھائی جا رہی ہے کہ وہ قرآن کو سمجھ نہیں سکتا۔ قرآن تو علماء کے لئے ہے — اور علماء میں سے چند ہی نے اس کو سمجھا ہے یہ سب کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ چیز قرآن اور اسلام دونوں کے خلاف ہے اور ایسے لوگ ہماری امت کے بنی اسرائیل اور احبار و رہبان ہیں جنہوں نے

بھی مسائل بنی اسرائیل کے دل میں یہ بات بٹھائی اور اپنی من مانی کرتے رہے اور جیب گرم کرتے رہے اور اب ہمارے یہاں بھی یہی ہو رہا ہے۔ ایسا کر کے گویا ہم بنی اسرائیل کی روایت کو دہرا رہے ہیں۔ ہمیں قرآن سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے خواہ جیسے بھی ممکن ہو ورنہ بنی اسرائیل کے انجام سے ہم بچ نہ سکیں گے، خدا ہمارے دلوں کو قرآن کے لیے کھول دے۔ آمین۔

[illegible]
۲۸ / ۲ / ۱۹۸۸

اعلان داخلہ

مدرسہ مصباح العلوم چوکونیاں۔

مدرسہ مصباح العلوم چوکونیاں ایک دینی تعلیمی و تربیتی ادارہ ہے۔ جامعۃ الفلاح بلریا گنج کے نصاب کے مطابق درجہ ہشتم تک تعلیم دی جاتی ہے۔ جامعہ ہی کے زیر نگرانی امتحانات بھی ہوتے ہیں۔ امسال ادارہ میں ۳۰۰ طلبہ وطالبات اور دارالاقامہ میں ۵۰ طلبہ زیر تعلیم رہے۔ اٹھارہ باصلاحیت اساتذہ و ملازمین ان کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔

اب نئے عزم کے ساتھ درجہ ہائے سوم (درجہ دہم) تک کی تعلیم کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ لہٰذا آپ تمام حضرات اپنے بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کیلئے ادارہ کی خدمات حاصل کریں۔ داخلے کی درخواستیں ۳۰ رمضان المبارک تک ناظم کے پاس بھیج دیں اور ۸ شوال تک لازماً مدرسہ پہنچنے کی کوشش کریں۔ داخلہ ٹسٹ کے ذریعہ مناسب درجوں میں کیا جائے گا۔

ناظم مدرسہ مصباح العلوم چوکونیاں۔ بھارت بھاری۔ بستی یو پی

انٹرویو

گفتگو و تحریر: محمد صلاح الدین

جمہوری انقلاب جمہوری کے ذریعے برپا کیا جاسکتا ہے

اخوان المسلمون سوڈان کے سربراہ ڈاکٹر حسن ترابی سے خرطوم میں لیا جانے والا فکر انگیز انٹرویو

سوڈان میں اسلامی انقلاب کے لئے اختیار کی جانے والی نئی حکمت عملی

ہم نے تمام مسلمانوں کیلئے اپنی پارٹی کے دروازے کھول دیے ہیں، شرط صرف مذہب کیلئے ہے، رکنیت کیلئے کلمہ گو ہونا ہی کافی ہے۔

اب سفر سوڈان کی ایک اہم چیز کی طرف آتا ہوں اور وہ انٹرویو ہے جسے اپنی گفتگو صرف اسی پر محدود رکھتا ہوں۔ یہ اخوان کے رہنما ڈاکٹر حسن ترابی صاحب کا انٹرویو ہے جو پاکستان میں خاص اسلام کی کوششوں میں منہمک تمام دینی قوتوں کے لئے نہایت فکر انگیز اور لائق توجہ ہے۔ ڈاکٹر حسن ترابی کا نام تو بہت عرصے سے سنا ہوا تھا۔ لیکن ان سے پہلا تفصیلی تعارف محترم اشفاق حسن قریشی صاحب کے اس انٹرویو کے ذریعہ ہوا جو انھوں نے برسوں قبل اپنے سفر امریکہ کے دوران لیا تھا اور جو ماہنامہ اردو ڈائجسٹ میں شائع ہوا تھا۔ بعد ازاں ان سے پہلی ملاقات لندن میں اسلامک کونسل آف یورپ کے دفتر میں ہوئی۔ پھر اسی کونسل کے تحت منعقدہ دو کانفرنسوں میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ کونسل نے مسلم ممالک کے لئے ایک مثالی دستور کا خاکہ اور اسلامی منشور انسانی حقوق مرتب کرنے کے لئے ۱۹۷۹ء میں پاکستان سے جناب خالد اسحاق اور راقم کو بلایا تو اس موقع پر بھی حسن ترابی، جناب صادق المہدی، ڈاکٹر اسماعیل راجی الفاروقی شہید، اخوان المسلمون کے مرشد عام عمر تلمسانی مرحوم اور دیگر اکابر سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ جناب حسن ترابی متعدد بار پاکستان آئے تو یہاں بھی ان سے تبادلہ خیال کا موقع ملتا رہا۔ ان سے بڑی مفصل ملاقات اسلام آباد میں ۱۹۸۴ء میں منعقدہ اسلامک کونسل آف یورپ کی کانفرنس کے دوران ہوئی ہم انھیں لے کر ہوٹل اسلام آباد کے ایک کمرہ میں بیٹھ گئے، جناب الطاف حسن قریشی، جناب حبیب الرحمان شامی، جناب ضیاء الاسلام انصاری، جناب عبدالقادر حسن بھی شریک گفتگو تھے۔ یہ نشست تقریباً ڈھائی گھنٹے رہی۔ ہمارا بنیادی سوال یہ تھا کہ آپ نمیری کی فوجی حکومت میں

کیوں شامل ہوئے۔ جناب حسن ترابی نے بڑی تفصیل سے اس کا پس منظر بیان کیا۔ ان کی گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ مصر ہو یا سوڈان، برصغیر ہندوستان ہو یا انڈونیشیا اور ملائشیا ہر جگہ مغربی استعمار کے خلاف اصل لڑائی دینی قوتوں نے لڑی۔ جہاد کے فتوے علماء نے جاری کئے۔ سب سے زیادہ قربانیاں انھوں نے دیں، بڑی بڑی تعداد میں قتل ہوئے، پھانسی پر چڑھائے گئے، جلاوطن ہوئے، جیلوں میں سڑے۔ وہاں کی قربانیوں کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ آزادی حاصل ہوئی تو انگریزوں کا پروردہ طبقہ جس کی بڑی تعداد فوج اور سول بیوروکریسی پر تھی مقتدر بن بیٹھا۔ سیاست، معیشت اور ہر شعبہ زندگی میں اس کا غلبہ ہو گیا۔ حصول آزادی کے بعد دینی قوتوں کو ایک نئے حریف کا سامنا کرنا پڑا، جو جلد کی رنگت کے لحاظ سے تو ان کا ہم وطن تھا مگر اپنی فکر تہذیب، سیاسی نظریات اور زبان و تمدن کے اعتبار سے اپنے سابقہ آقاؤں کا جانشین، ان کے مفادات کا نگران تھا۔ اس کا انداز فکر سیکولر تھا۔ یہ مذہب کو انفرادی مسئلہ کہتا تھا۔ اجتماعی زندگی میں اسے مذہب کا عمل دخل گوارا نہ تھا۔ ٹھیک یہی دور اشتراکیت کے علمبرداروں کی نظریاتی یلغار کا تھا۔ اب ہر مسلم ملک میں تین قوتیں ابھر آئیں۔ سیکولرزم کے حامی حکمران اور ان کے سول و فوجی حکام، اشتراکیت کے علمبردار اور دینی جماعتیں۔ سیکولرزم والوں کے پاس فکر کا خانہ خالی تھا۔ وہ سیاسی و معاشی قوت رکھتے تھے۔ طاقت ہر مسئلہ کا حل تھا۔ اشتراکیت کے پاس ایک نظریہ تھا مگر دلیل نہ تھی صرف جذبات کو انگیخت کرنے کا فن اسے آتا تھا۔ طاقت کے اس مثلث میں دو عنصروں نے سیکولرزم اور اشتراکیت کو ایک دوسرے کا معاون بنا دیا! متحدہ سیکولر قوتوں کو دینی تحریکات سے نمٹنے اور انھیں کچلنے کے لئے بڑی پروپیگنڈہ مشنری کے لئے قلم کاروں کی ضرورت تھی جو اشتراکی ادیبوں دانشوروں اور شاعروں نے فراہم کر دی۔ چنانچہ ریڈیو، ٹی وی، اخبارات

اور تنظیم کے شعبے ان کی گرفت میں چلے گئے۔ تعلیم گاہوں پر ان کا تسلط ہو گیا اور ثقافت کے حلقے میں، انھیں ایک طرف سرکاری مشنری سے، بڑے دفتروں کے وسیع مواقع حاصل ہو گئے اور دوسری طرف سرکاری وسائل اور اقتدار کی قوت ان کے دست تصرف میں آ گئی۔ اس متحدہ قوت کے مقابلے میں دینی تحریکیں تنہا وسائل سے محروم اور قوت سے تہی دست رہ گئیں۔ ادھر چالاک اشتراکی معاونین

کتابوں کی بڑی اہمیت ہے لیکن تحریکیں محض کتابوں سے برپا نہیں ہوتیں، اس کے لئے عام لوگوں سے براہ راست رابطہ اور انکے مسائل میں شرکت ناگزیر ہے

اور ان کے بیرونی سرپرست حکمرانوں کو یہ باور کراتے رہے کہ انھیں اصل خطرہ ان مذہبی جنونیوں سے ہے۔ اس معاملہ میں ملک کے اندر سیکولر حکمران اور اشتراکی معاونین اور بیرون ملک ان کے سرپرست امریکہ اور روس سب کے مفادات باہم مل گئے اور اسلام دشمنی ان کا متفقہ موقف بن گیا۔ دنیا کے تمام نو آزاد مسلم ممالک میں سرکاری وسائل عہدوں اور مناصب سے سب سے زیادہ فائدہ اشتراکی عناصر نے اٹھایا۔ اور حکومت اور دینی قوتوں کے درمیان تصادم کو شدید سے شدید تر بنانے، ظلم و تشدد کے سلسلے دراز کرنے میں اسی طبقے کا ہاتھ سب سے زیادہ کارفرما رہا۔ گذشتہ پچاس سال سے مراکش سے انڈونیشیا تک پوری مسلم دنیا کا منظر یہی ہے۔ ہم نے اس کے اسباب و نتائج کا جائزہ لیا اور اس پر نظرثانی کی ضرورت محسوس کی ہم اس حقیقت سے بھی باخبر تھے کہ حکمران، اشتراکیوں کے استعمال سے عاجز آچکے ہیں مگر وہ ان سے نجات پانے کی راہ نہیں دیکھتے۔ وہ انھیں الگ کرکے ان کی اور دینی تحریکوں کی متحدہ مخالفت کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ انھیں

حالات زندگی

سوڈان میں الاخوان المسلمون کے رہنما الجبہۃ الاسلامیۃ القومیہ (اسلامک نیشنل فرنٹ) کے قائد اور ورلڈ اسلامک کے نائب صدر جناب حسن ترابی ۱۹۳۲ء میں پیدا ہوئے۔ وہ مہدی سوڈانی کے نواسے ہیں اور انکے پوتے صادق المہدی (سابق وزیراعظم سوڈان) کے برادر نسبتی ہیں۔ حسن ترابی نے خرطوم یونیورسٹی سے قانون میں گریجویشن کیا اور لندن سے ماسٹر کی ڈگری حاصل کی۔ انھوں نے ۱۹۶۲ء میں سوربون یونیورسٹی فرانس سے قانون میں پی ایچ ڈی کیا اور خرطوم یونیورسٹی میں ڈین آف فیکلٹی آف لاء مقرر ہوئے جہاں انھوں نے ۱۹۶۳ء تک خدمات انجام دیں۔ ۱۹۶۳ء میں جنرل عبود کے خلاف تحریک میں سرگرم حصہ لیا اور جبہۃ المیثاق الاسلامی (اسلامک پیپلز فرنٹ) کے رہنما تھے اور ۱۹۶۹ء تک اس کی قیادت کرتے رہے۔ نمیری کے دور میں وہ اخوان المسلمون کے سیکرٹری جنرل اور مرشد عام کی حیثیت سے گرفتار کئے گئے جو بعد ازاں رہا بھی کئے گئے اور خاص سرگرم رہے۔ ۱۹۷۷ء میں وہ ایک معاہدہ کے تحت ملک کی واحد حکمران پارٹی سوشلسٹ یونین کے رکن اور اٹارنی جنرل مقرر ہوئے۔ پھر امور خارجہ کے صدارتی امیدوار کا عہدہ سنبھالا۔ ان کی سیاسی زندگی کا اہم موڑ تھا۔ انھوں نے ان عہدوں کے ذریعے سرکاری مشینری میں اپنا اثر و نفوذ بڑھایا اور اخوان کو مستحکم کیا۔ ۱۹۸۵ء میں اپنے مغربی دوستوں اور کمیونسٹ ساتھیوں کے دباؤ پر صدر نمیری نے انھیں گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔

ایک بیاد دیگار رہا ہے جو اس مصیبت سے نجات کا راستہ نکالنا چاہتی ہے اپنی حماقت اور غلط ترجیحات نے دینی قوتوں کو اتنا دور کر دیا ہے کہ وہ حکومت کے قریب آنے کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ علاوہ ازیں گزشتہ ایک ڈیڑھ صدی میں پہلے انگریزوں، ولندیزیوں اور فرانسیسیوں کے خلاف مسلسل جہاد اور پھر آزاد ملکوں میں ان کے جانشینوں سے پیہم کشمکش نے دینی جماعتوں اور رہنماؤں کے اندر حکومت کے خلاف مزاحمت کا ایک ایسا ذہنی رجحان پیدا کر دیا ہے کہ وہ کسی دوسرے کردار کو اپنانے کا خیال تک ذہن میں نہیں لا سکتیں وہ یک رُخے (SINGLE TRACKED) سیاسی کردار کی سختی سے جم گئی ہیں اور اس کے نتیجے میں مسلسل ظلم و ستم کا نشانہ بن رہی ہیں۔ وہ سیاسی اقتدار سے مقصد یہ کو بیان میں جا دیتی ہیں اور حصول اقتدار کو اپنے لئے حرام بھی ٹھہرائے ہوئے ہیں قرب اقتدار ایک گالی بن گیا ہے اور اس کی خواہش قابل مذمت فعل۔ آخر اس نفسیاتی گرہ کو کیسے کھولا جائے۔

جناب حسن ترابی نے اپنے اس منفرد اور نہایت بصیرت افروز تجزیہ میں بتایا کہ مسلم ممالک کی سرکاری مشینری جس میں فوج، سول بیورو کریسی، سیاست، تعلیم اور دوسرے تمام شعبے شامل ہیں، دیندار لوگوں سے خالی ہو گئی ہے جو موجود تھے وہ نکال باہر کئے گئے اور دوسری طرف ان کے داخلے کے تمام دروازے بند کر دیئے گئے۔ ہم نے نئے تجربے کی ٹھانی اور اس صورت حال کو تبدیل کرنے کے لئے جرأت مندانہ فیصلہ کیا جو بلا شبہ خطرات سے معمور ہے۔ ہم نے نمیری سے شریعت کے نفاذ کی شرط پر تعاون کا معاہدہ کیا۔ اس نے اشتراکی سازشی ٹولے کو جو دوبار بغاوت کر کے حکومت پر خود قابض ہونے کی سازش کر چکا تھا، نکال باہر کیا۔ ہم نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر تعلیم، فوج اور دیگر شعبوں میں محب اسلام نوجوانوں کو تیزی سے داخل کرنا شروع کیا اور سرکاری مشینری کے سیکولر اور اشتراکی رنگ کو اسلامی رنگ میں ڈھالنے کی مہم کا

اور المہب ات بھی ہو گئی گرفتاری اور کمانڈر جنرل عبدالرحمن صدر جار حاضر سے دور اقتدار کے قوانین پر عمل میں آئی جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان کی دشمنی بھی امریکہ اور روس دونوں یکساں بلکہ متحد اور متفق رہے ہیں۔ اپریل ۱۹۸۵ء میں اپنی رہائی کے بعد حسن ترابی نے الجبہۃ الاسلامیہ القومیہ (اسلامک نیشنل فرنٹ NIF) کی بنیاد رکھی جو سوڈان کی اسلامی قوتوں کا متحدہ محاذ ہے اور ملک میں نفاذ شریعت کی تحریک کا علمبردار ہے۔ وہ اس وقت اس فرنٹ کے سیکریٹری جنرل ہیں۔ گزشتہ انتخابات میں انھیں شکست دینے کے لئے دیگر جماعتوں نے ان کے خلاف انتخاب میں متحدہ محاذ بنایا تھا جس میں صادق المہدی کی امہ پارٹی، مرغنی کی الاتحادی ڈیموکریٹک پارٹی،

ہم لوگوں کو سمیٹتے کم بکھیرتے زیادہ ہیں تاکہ وہ اپنے اپنے شعبوں میں اسلامی اقدار کی ترویج کیلئے کام کریں

آغاز کیا جس کے بڑے حوصلہ افزا نتائج سامنے آئے ہیں اور انشاءاللہ وہ بہت دور رس ثابت ہوں گے۔ جناب حسن ترابی نے بتایا کہ روس ہو یا امریکہ یہ دونوں ملک سرد سنر چیک کے ذریعے ہم پر قابض ہیں اور اپنی کے ذریعے انقلاب در انقلاب کا چکر چلا کر ہم پر اپنے ایجنٹ مسلط کرتے رہتے ہیں۔ اگر ملک کی سول اور فوجی سروس میں محب اسلام لوگوں کا غلبہ ہو تو اور سیاست پر بھی انکی گرفت مضبوط ہو تو پھر ہم پر کوئی سامراجی اور استعماری قوت مسلط نہیں ہو سکتی۔

جناب حسن ترابی سے یہ گفتگو ایسے موقع پر ہوئی تھی کہ اسلام آباد سے کراچی واپس آتے ہی میں جسارت سے سبکدوشی کے مراحل میں پھنس گیا اور تین ہفتوں کے اندر اندر تمام مراحل طے کر کے وہاں سے رخصت ہو گیا، یوں اس اہم ملاقات کو قلمبند کرنے کا موقع نہ مل سکا اب تازہ انٹرویوں کے ساتھ اس کا تذکرہ بطور تمہید کر دیا ہے تاکہ فکر کا پس منظر بھی ان کے خیالات سمجھنے میں مزید مددگار ہو سکے۔

حسن ترابی سے میمپس کے افتتاحی اجلاس میں ملاقات ہوئی تو بہت تپاک سے ملے، پاکستان کا حال دریافت کیا اور کراچی کے تازہ واقعات پر گہرے دکھ کا اظہار کیا۔ میں نے انٹرویو کی درخواست کی تو بخوشی سے قبول کیا اور کہا کہ اس طرح مجھے آپ سے پاکستان کے حالات تفصیل سے سننے کا موقع مل جائے گا۔ اسی اجلاس میں وزیراعظم صادق المہدی سے انٹرویو کے لئے بات ہوئی، انھوں نے اگلے دن اپنی قیام گاہ پر عشائیہ میں وقت طے کرنے کا وعدہ کیا۔ عشائیہ پر پھر یاد دہانی

بعث پارٹی کے شامل اور عراقی نواز اپنی کمیونسٹ پارٹی سب شریک تھے۔ اس میں ڈکشنری کے امیدوار یونین پارٹی کے حسین شیبہ تھے جن حسن ترابی نے صرف دو ہزار ووٹ سے شکست کھائی۔ انکی پارٹی کو اسمبلی میں ۵۱ اور یونین پارٹی کے بعد تیسری پوزیشن حاصل ہے لیکن ملک کے پڑھے لکھے طبقے اور یونیورسٹیوں پر اخوان ہی کا غالب ہے اور اسمبلی سے باہر رہنے کے باوجود ملک میں اصل قائد اختلاف جناب حسن ترابی ہی ہیں۔ ڈاکٹر حسن ترابی متعدد کتابوں کے مصنف ہیں جن میں "صلوٰۃ، عماد الدین" "الایمان والحیاۃ"، "رسالہ فی المرأۃ"، "رسالۃ فی الفقہ" وغیرہ اور انگریزی کتاب "ISLAM AND ITS IMPACT ON HUMAN LIFE" شامل ہیں تو فقہ کا خصوصی شعبہ ہے مختلف بین الاقوامی کانفرنسوں میں وہ سیکڑوں مقالات پیش کر چکے ہیں۔ حالیہ کانفرنس میں بھی انھوں نے فقہ کی تدوین جدید کے موضوع پر انگریزی مقالہ پیش کیا ہے۔

کرانی تو انھوں نے بتایا کہ میں کل صبح اندرون ملک دورے پر جا رہا ہوں، اگر آپ کو مطلع کر دیا جاتا تو ان کی واپسی اختتامی اجلاس سے کچھ دیر پہلے ہوتی۔ کل صبح جہاز کی روانگی ہوگی۔ انھوں نے اظہار افسوس کیا کہ واپسی میں تاخیر کے باعث میں وقت نہ دے سکا۔ پاکستان کے لئے انھوں نے نیک خواہشات کا اظہار کیا تاہم انٹرویو نہ ہو سکا۔

پانچ دن سیمینار کے تین تین اجلاسوں نے صبح سے شام تک مصروف رکھا۔ آخری دن اختتامی اجلاس شام کو تھا اور صبح کمیشنوں کے اجلاس تھے۔ میں ڈاکٹر طٰہٰ جابر سے اجازت لے کر ۲۰ جنوری کو صبح ۱۰ بجے جناب حسن ترابی کی قیام گاہ جا پہنچا۔ تقریباً سوا دو گھنٹے نشست رہی۔ اسلامی انقلاب کے لئے ان کے انداز فکر اور طریق کار نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس سے قبل سیمینار میں خرطوم یونیورسٹی کے ایک جلسہ عام میں اور شہری زندگی میں بہت نمایاں طور پر دیکھ چکا تھا۔ اس بار ان کے ارشادات میں وسعت سے زیادہ دلیل کا وزن محسوس ہوا۔ حسن ترابی کی ذات میں جدید و قدیم علوم کا بڑا حسین امتزاج ہے۔ وہ شعلہ بیان مقرر ہیں۔ نوجوان طلبہ و طالبات، اساتذہ، اہل علم سب ہی ان کی تقریروں سے مسحور ہوتے ہیں۔ ان میں جوانوں کی سی رعنائی اور توانائی ہے۔ انتہائی مستعد اور بیدار مغز انسان ہیں۔ سب سے بڑی خوبی یہ کہ عام لوگوں میں گھل مل جاتے ہیں۔ کسی بڑائی کے احساس یا لیڈر مقامی کے طمطراق میں مبتلا نہیں۔ نوجوان تو ان کے دیوانے ہیں۔ وہ بہت بااخلاق، متواضع اور بذلہ سنج ہیں۔ ان کے ہاں دینی خشونت زدہ ہے، نہ زہد و تقویٰ کے کسی بھاری بوجھ تلے دبا ہوا۔ ان سے ملاقات کے لئے کسی کو مرعوب اور دست بستہ ہونے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ وہ عام معاشرتی رکھ رکھاؤ کے ساتھ خندہ پیشانی سے ملتے اور بات توجہ سے سنتے ہیں۔ کسی سوال پر برہم نہیں ہوتے۔ لبوں پر ہر وقت مسکراہٹ کھیلتی اور آنکھوں میں ذہانت اور تدبر کی روشنی چمکتی رہتی ہے۔

میرا پہلا سوال یہ تھا کہ سوڈان کے اس وقت بڑے مسائل کیا ہیں؟ جناب حسن ترابی نے بتایا کہ اس وقت سب سے بڑا مسئلہ شمال اور جنوب کا تنازعہ ہے۔ جنوبی سوڈان کی آبادی تقریباً ۵۰ لاکھ ہے۔ ان میں ۳۰ لاکھ بت پرست یعنی قدیم بت پرست قبائل، ۱۰ لاکھ عیسائی اور باقی مسلمان ہیں۔ برطانیہ نے اپنی ڈیوائڈ اینڈ رول والی پالیسی کے تحت اس علاقے کو تہذیبی، ثقافتی، مذہبی اور سیاسی لحاظ سے شمال سے بالکل الگ رکھا بلکہ وہاں علیحدگی پسند رجحانات کو فروغ دیا۔ وہ تو رخصت ہونے سے پہلے اسے کاٹ کر ایک جداگانہ ریاست بنانا چاہتے تھے لیکن ملک کی سیاسی قوتوں نے انھیں اس کا موقع

نہ دیا۔ یہاں لوگوں میں نسلی، لسانی اور مذہبی عصبیتوں کو ابھارا گیا۔ مشنریوں کے ذریعہ عیسائیت کی تبلیغ کی گئی۔ اس علاقے میں تیل موجود ہے، معدنیات ہیں۔ سرحدوں سے متصل پڑوسی ملک ایتھوپیا یہاں اسلحہ اور تخریب کاری کا گڑھ بنا ہوا ہے۔ یہاں روس اور امریکہ دونوں ہی بڑی قوتوں کی سرپرستی کر رہے ہیں جس کا مقصد مسلم سوڈان کو دو ٹکڑے کرنا ہے۔ ایک بیرونی [illegible] ہم نے میثاق ملی کے نام سے اپنی تجاویز دی ہیں۔ ہم اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ [illegible] کابینہ کے اندر رہ کر [illegible] تجاویز اور مذاکرات کے علاوہ تحریک اسلامی نے اس علاقے میں کام کے لئے طویل المیعاد اور قلیل المیعاد منصوبے بھی تیار کئے ہیں۔ طویل المیعاد منصوبے میں تعلیم، سوشل سروس، تبلیغ اور مسلمان تنظیموں کو جو وہاں کمزور اور پسماندہ ہیں وسائل کی فراہمی شامل ہے۔ قلیل المیعاد منصوبے میں اقتصادی اور سیاسی اسباب دور کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ یہ علاقہ قحط اور خشک سالی کا زیادہ شکار ہے اور دوسرے متاثرہ علاقوں کے لوگ کثیر تعداد میں یہاں پہنچ رہے ہیں۔ [illegible] کیونکہ قحط زدگان کو بھی ملک ہم داخلی وسائل سے خوراک، علاج اور رہائش کی سہولتیں مہیا کر رہے ہیں۔

ہمارا دوسرا مسئلہ اقتصادی ہے۔ اس کے سیاسی اسباب بھی ہیں۔ انگریزوں نے ان تمام ملکوں کو اپنے کارخانوں کیلئے خام مال کی فراہمی اور مصنوعات کی منڈی بنائے رکھنے کے لئے صنعتی ترقی سے محروم رکھا ہے۔ جہاں جہاں انکی حکومت رہی ہے۔ سوڈان صنعتی لحاظ سے بہت پسماندہ ہے۔ اس کا ذریعہ معاش زیادہ تر زراعت پر منحصر ہے۔

مختلف ممالک اور علاقے اسے [illegible]

شیخ کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ یہ رقبے کے لحاظ سے افریقہ کا سب سے بڑا ملک ہے لیکن ذرائع مواصلات بہت محدود ہیں۔ انتظامی مسائل بھی اسی وجہ سے پیچیدہ ہیں۔ صنعتی اور اقتصادی ترقی کے لئے ہماری پارٹی نے حال ہی میں ایک منصوبہ تیار کیا ہے جس میں اہم تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ صنعتوں کے قیام میں اصل رکاوٹ ٹیکسوں کا نظام ہے۔ یہ بھی انگریز کی طے کردہ پالیسی تھی تاکہ اس میدان میں سرمایہ کاری کی حوصلہ شکنی ہو۔ چنانچہ محض اس رکاوٹ کی وجہ سے بہت سے لوگ ملک چھوڑ کر چلے گئے۔ [illegible] صنعتی ترقی کے بغیر نہ روزگار کے مواقع پیدا ہو سکتے ہیں، نہ بیروزگاری دور کی جا سکتی ہے۔

تیسرا مسئلہ عدم استحکام ہے۔ ۱۹۵۶ء میں حصول آزادی کے بعد سے ہمارے ہاں صورتحال یہ رہی ہے [illegible] دو طرح کی ہیں۔ سیاسی جماعتیں ملک گیر سطح پر کمزور ہیں۔ اکثر جماعتیں مذہبی ہیں مگر اپنے روایتی تصور مذہب کے تحت ان کا سیاسی مسلک سیکولر ہے۔ کمیونسٹوں کا بھی کہیں کہیں اثر و نفوذ ہے اور وہ

دکھی باکی پشت پناہی سے انھیں اپنی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع کرنے کا موقع ملا۔ چاہے یہاں زیادہ تر فوجی حکومت رہی، جمہوری ڈھانچہ مستحکم اور جمہوری اقدار و روایات ابھی پائیدار نہیں ہیں۔ اس وقت صادق المہدی کی امہ پارٹی اور صدر سید عثمان مرغنی کی یونین پارٹی کی مخلوط حکومت بظاہر اسلامی قوتوں کی حکومت ہے لیکن حقیقتاً یہ سیکولر حکومت ہے۔ نمیری کے دور میں جو اسلامی قوانین نافذ کئے گئے تھے، وہ منسوخ تو نہیں ہوئے اور نہ انھیں منسوخ کرنے کی کسی میں ہمت ہے مگر عمل درآمد روک کر انھیں غیر موثر ضرور بنا دیا گیا ہے۔ نفاذ شریعت کا مزید کام معطل ہے۔ اسی صورت حال کے پیش نظر ہم نے اسلامک نیشنل فرنٹ (NIF) تشکیل دی ہے جس نے انتخابات میں تیسری پوزیشن حاصل کی ہے اس وقت اسمبلی کی ۲۶۰ نشستوں میں امہ پارٹی کی ۹۹، یونین کی ۶۳ اور اسلامک فرنٹ کی ۵۲ نشستیں ہیں۔ ۲ نشستیں کمیونسٹوں کے پاس ہیں، باقی جنوب کے مختلف گروہوں کے قبضے میں ہیں۔ ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ہمارے دستور میں گریجویٹس کے لئے چھبیس نشستیں مخصوص کی گئی ہیں جن میں سے ۲۳ ہمارے پاس ہیں۔ یہ اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ ملک کے پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ طبقے کی بھاری اکثریت ہمارے ساتھ ہے۔ اس کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ دارالحکومت خرطوم میں ڈالے جانے والے مجموعی ووٹوں میں ۵۵ فیصد ووٹ نیشنل فرنٹ کو ملے ہیں۔

اس سوال پر کہ مخلوط حکومت میں اختلافات کی خبریں مسلسل آ رہی ہیں، کیا ان حالات میں یہ حکومت اپنے بقیہ تین سال پورے کر سکے گی؟ جناب حسن ترابی نے کہا کہ مجھے اس میں شبہ ہے بلکہ اندیشہ ہے کہ شاید جلد ہی یہ حکومت ٹوٹ جائے۔ اس سلسلے میں امہ پارٹی اور یونین پارٹی سے ہمارے مذاکرات بھی جاری ہیں۔ ہمارا بنیادی مطالبہ نفاذ اسلام کے عمل کو تیز کرنا ہے۔ ہماری شرائط مان لی گئیں اور کوئی معاہدہ طے پا گیا تو تبدیلی ناگزیر ہے۔

آپ کا حکومت سے اصل اختلاف کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں جناب حسن ترابی نے کہا کہ بنیادی مسئلہ نفاذ اسلام کا ہے۔ اس حکومت نے اس خوشگوار عمل کو، جو اندرون ملک اور پوری مسلم دنیا میں غیر معمولی جوش و خروش کے ساتھ سراہا گیا تھا، روک دیا اور اس سمت میں پیش رفت بالکل معطل ہو گئی ہے۔ ہمارا اختلاف جنوب کے مسئلہ اور اقتصادی صورت حال سے متعلق حکومت کی گومگوں کی پالیسی پر بھی ہے۔ یہ اپروچ کا اختلاف ہے۔ اسلام کے معاملہ میں ہم راسخ اور انقلابی

اندازِ فکر کا تصادم ہے جو آپ کے یہاں اور پوری مسلم دنیا میں موجود ہے۔ جب اسلام نوجوان طبقہ جو جدید دنیا کے تقاضوں کا پورا شعور رکھتا ہے اب روایتی طریقوں سے مطمئن نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام کو رسوم کی دنیا سے نکال کر قانون اور دستور کی دنیا میں لوٹنا ہو گا، اسے اب کوئی نہیں روک سکتا۔

میرے ایک ضمنی سوال پر جناب حسن ترابی نے وضاحت کی کہ ہمارے ہاں مسالک کا کوئی جھگڑا نہیں تمام مسلمان مالکی فقہ پر کاربند ہیں۔ یہاں صوفیاء کے مختلف مدارس فکر موجود ہیں مگر آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ نفاذ اسلام کے معاملہ میں وہ سب سے زیادہ پرجوش ہیں اور ہمارے فرنٹ میں شامل یا اس کے حامی ہیں۔ شہری آبادی بھی بہت سنجیدہ اور پرجوش ہے البتہ دیہی علاقوں میں روایتی انداز فکر یعنی رسوم پرستی کا غلبہ ہے۔ اطمینان اور حیرت کی بات یہ ہے کہ ہماری خواتین اور طالبات اس

افغان مجاہدین نے پوری ملت اسلامیہ کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے اور روس کیلئے فرار کے سوا کوئی راہ باقی نہیں چھوڑی۔

معاملہ میں بہت راسخ ذہن رکھتی ہیں۔ وہ کٹر دینی ہیں، ان پر مغربی تہذیب کا اثر بہت کم ہے اور اس موضوع پر انشاء اللہ ایک علیحدہ مضمون میں تفصیل پیش کروں گا۔ یہاں ایران جیسی کسی تنظیم کا وجود نہیں۔ سوڈان کے اسلامی مزاج اور اب روس کے افغانستان پر ضرب سے بہت حواس باختہ ہیں۔ نمیری سے وہ اسی لئے ناراض ہوا کہ انھوں نے یہ کیا کام شروع کر دیا؟ اس سلسلہ میں افریقی ایشیائی اور بالخصوص عرب مسلم ممالک پر سخت دباؤ ڈالا گیا، اور نمیری کی حوصلہ افزائی سے انھیں نہ صرف روکا گیا بلکہ ان کی امداد بند کرنے کی دھمکیاں دی گئیں اور خود انھیں اس "معقول" عمل سے سخت پرہیز کرنے کے لئے متنبہ کیا گیا۔ نمیری اس دباؤ میں آگیا اور یہی چیز اس کی رخصت کا سبب بنی۔

میں نے اپنے علم اور مشاہدہ کی بنیاد پر جب حسن ترابی کو بتایا کہ عام لوگ تو نمیری کو یاد کرنے لگے ہیں۔ ان کے دور میں گوشت ڈھائی پونڈ (سوڈانی) کلو تھا۔ اب ۱۲ پونڈ کلو ہے اور چھوٹا گوشت ۵۰ پونڈ کلو تک جا پہنچا ہے۔ علاوہ ازیں دفتری نظم و نسق ابتر ہوا ہے۔ عام اشیاء کی قیمتیں بہت بڑھ گئی ہیں اور امن عامہ کی صورت حال بھی بگڑی ہے تو انھوں نے ہنس کر کہا "یہ آمریت کے مقابلے میں جمہوریت کی قیمت ہے"۔ انھوں نے میری معلومات سے اتفاق کیا اور کہا کہ جمہوریت آنے سے

ہر شخص کو آزادی حاصل ہونے کا ایک گراں کن احساس ہوتا ہے۔ وہ سخت ڈسپلن سے نجات پاکر کچھ سست پڑ جاتا ہے لیکن یہ ایسا مسئلہ نہیں ہے جسے حل نہ کیا جا سکے۔ یہ محض موجودہ حکومت کی کاروائی اور غیر ذمہ داری کا نتیجہ ہے۔ مہنگائی کچھ مصنوعی ہے کچھ حقیقی۔ اشیاء کی قیمتوں کی پشت پر آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے قرضوں سے جو زر تلافی (SUBSIDY) ادا کی جاتی ہے وہ بند ہو گئی ہے قرضے ملک گروی رکھنے کا ذریعہ ہیں، ان سے نجات پانے کے لئے بہرحال قیمتوں پر اضافی بوجھ پڑیگا البتہ عوام آدھا بوجھ کم کرنے کے لئے حکومت مصنوعی اسباب کا خاتمہ کر سکتی ہے۔

لیکن یہ صورت حال کیا عوام کو جمہوریت سے مایوس اور متنفر نہیں کرے گی؟ میں نے ایک خطرے کی نشاندہی کی، جناب حسن ترابی نے کہا کہ یہ خطرہ کسی حد تک موجود ہے لیکن میرا خیال ہے عوام کا سیاسی شعور پنجرے میں مقید شیر کو ملنے والے مفت کے گوشت کے بجائے آزاد شیر کی طرح جنگل کے گوشت کو ترجیح دیگا۔ یہ عوام کے سیاسی شعور کی تربیت کا مسئلہ ہے اور سوڈان کے لوگ اب اس مسئلہ میں پسماندہ نہیں ہیں۔

میرا اگلا سوال تھا، کیا مستقبل میں کسی فوجی انقلاب کا خطرہ تو نہیں؟ جناب ترابی نے پر اعتماد لہجے میں کہا کہ نہیں! اس کا اب کوئی امکان نہیں۔ ہماری موجودہ فوجی قیادت تو اپنے وعدہ کے مطابق ٹھیک ایک سال میں مقررہ تاریخوں میں انتخابات مکمل کرا کے اور صدر سے لے کر نچلی سطح تک تمام سیاسی عہدوں پر منتخب افراد کو اقتدار منتقل کرکے بیرکوں میں واپس چلی گئی ہے۔ جس نے دنیا بھر میں ایک نئی نظیر قائم کرکے اپنا وقار بلند کیا ہے۔ وہ اسے داغدار نہیں کرے گی۔

تحریک اسلامی میں نئے تجربات اور سوڈان میں جس کے اثرات و نتائج سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر حسن ترابی نے کہا کہ دراصل ہم تحریروں پر بہت زیادہ انحصار کرتے رہے ہیں۔ بنیادی فکری مواد کی فراہمی اور ذہنی تربیت کے لئے بلاشبہ کتابوں کی بڑی اہمیت ہے لیکن تحریکیں محض کتابوں سے برپا نہیں ہوتیں۔ یہ میدان کا کام ہے جہاں عام لوگوں سے زیادہ سے زیادہ رابطے ان کی عملی شرکت کے لئے زیادہ سے زیادہ مواقع، قائدین اور پیروکاروں کے درمیان روابط و تعلقات میں قربت اور شعور کی بیداری کے ساتھ ساتھ جذبات کی اٹھان اور عوامی سطح پر ان کی لہروں کے تموج سے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ ہم جہاں کہیں کتابوں سے چپک کر رہ گئے اور اپنی ترتیبی روایات کے اسیر ہو گئے

ایران عراق جنگ کے نتیجے میں ہمارا خون نالیوں میں بہہ رہا ہے ہمارا سرمایہ یہودیوں کی تجوری میں جا رہا ہے۔ خدا جانے اس خسارے اور خودکشی کا احساس کب ہوگا؟

وہاں تحریک جمود اور تعطل کا شکار ہوگئی۔ ہم نے وعظ و تلقین پر انحصار نہیں کیا۔ باقاعدہ منصوبہ بندی کرکے عوامی زندگی کے ہر شعبہ میں چھلانگ لگائی ہے۔ ہم زندگی کے ہر شعبے میں موجود ہیں۔ کوئی گوشہ ہمارے وجود سے خالی نہیں ہم بین الاقوامی امور سے لے کر داخلی امور تک ہر شعبے کی باقاعدہ منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ اس سے متعلق مواد کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ہماری کمیٹیاں ان منصوبوں کو مرتب کرتی ہیں۔ اور کام کے دوران نتائج کا مسلسل جائزہ لیا جاتا ہے۔ جہاں کمی محسوس ہوتی ہے ہم منصوبہ پر نظر ثانی کرکے ضروری رد و بدل کرتے ہیں اور اپنی کوششوں کو نتیجہ خیز بنانے پر پوری توجہ دیتے ہیں۔ جو کوششیں بار آور نہ ہوں آخر انہیں جاری رکھنے کا فائدہ؟

ڈاکٹر حسن ترابی نے اس پہلو پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالی۔ وہ برطانیہ، فرانس اور امریکہ میں جمہوری نظام کا نہ صرف گہرا مطالعہ بلکہ براہ راست اس کا مشاہدہ اور تجربہ بھی رکھتے ہیں۔ انہوں نے ایک زیرک سیاستدان کے لہجے میں کہا کہ جمہوری ذرائع سے تبدیلی، جمہوری عمل میں شرکت ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ جمہوریت میں فیصلہ اسمبلی کے اندر ہوتا ہے اس سے باہر تعداد کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ ہم کسی کا سیاسی وزن تولنے کے لئے اسمبلی میں نشستوں کی تعداد انتخابات میں ووٹوں کی تعداد، جلسوں میں سامعین کی تعداد، اور مختلف تنظیموں میں حامیوں کی تعداد ہی کو بنیاد بناتے ہیں سروں کی تعداد شمار کرنے کا اصول اخلاقی اور فلسفیانہ بنیاد پر کتنا ہی غلط کیوں نہ ہو بہرحال جمہوری فیصلہ اسی کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اس لئے جمہوری ذرائع سے انقلاب برپا کرنے کی علمبردار کوئی اسلامی تحریک تعداد کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کر سکتی ہم نے اسی لئے اس پہلو پر خصوصی توجہ دی ہے۔ ہم نے ہر شعبۂ زندگی میں لوگوں کی شرکت کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ ہم ان کے انفرادی و اجتماعی مسائل میں گہری دلچسپی لیتے ہیں۔ ہر شخص کو اپنی پسند کے میدان میں کام کرنے کا موقع دیتے ہیں۔ وہ کھلاڑی ہے تو اپنے میدان میں کام کرنے دیتے

ادیب شاعر یا مصور ہے تو وہاں اپنی صلاحیت استعمال کرے۔ ہم لوگوں کو سمیٹتے کم اور بکھیرتے زیادہ ہیں تاکہ وہ اپنے اپنے شعبے میں اسلامی اقدار کی ترویج کے لئے کام کریں۔ ہماری خواتین اپنے میدان میں سرگرم ہیں۔ اس وقت مزدوروں، طلباء، وکلاء، تاجروں، اساتذہ اور دیگر پیشوں سے وابستہ افراد کی تمام بڑی تنظیمیں ہمارے پاس ہیں۔ ہمارا تنظیمی ڈھانچہ وسیع ترین ہے اور وہ روز بروز مزید وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ تنظیموں کے علاوہ ہمیں پبلک عوام کے درمیان ہم آہنگی اور یکجہتی ہے۔ اس لئے ہم نے عوام کی صفوں کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا ہوا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے پاس ۵۰ فیصد ووٹ ہوں گے تو ہم کامیاب ہوسکیں گے ورنہ نہیں۔ اس فکر اور تجربے کے بہترین نتائج سامنے آئے ہیں۔ ہماری اصل قوت ہمارے عوام ہیں۔ اس موقع پر میں نے پوچھا کہ آپ کے ہاں معیار رکنیت کیا ہے؟ حسن ترابی صاحب نے ہنس کر جواب دیا "بس مسلمان ہونا کافی ہے"۔ میں نے دریافت کیا کوئی درجہ بندی؟ فرمایا کہ صرف منصب کے لئے شرائط ہیں۔ رکنیت کے لئے کلمہ گو ہونے کی شرط کے سوا کوئی شرط نہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جو شخص بھی اسلام سے ذہنی اور قلبی لگاؤ رکھتا ہے وہ عمل میں کیسا ہی کوتاہ ہو اسے ہمارا ساتھی بننا چاہئے۔ وہ ہمارے درمیان آئے گا تو خیر کے ساتھ آئے گا اور ماحول اسے خود بخود خیر کی راہ پر آگے دکھائے گا پھر وہ اپنی صلاحیت کے مطابق پارٹی میں جگہ بنائے گا۔ فکر اسلام وہی ہمارا سرمایہ ہے جو ہمارے پاس جمع ہونا چاہئے۔ ہم پارٹی میں سینیارٹی کے بھی قائل نہیں ہیں۔ حضرت عمرؓ مکہ میں سب کے بعد ایمان لائے مگر اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے حضرت ابوبکرؓ کے بعد سب سے آگے آگئے۔ سوڈان میں تحریک اسلامی کے مستقبل کے بارے میں انھوں نے کہا کہ میں رجائیت پسند ہوں۔ انھوں نے پختہ یقین ظاہر کیا کہ انشاء اللہ دس سال سے بھی کم مدت میں ہم اس ملک کو مکمل طور پر نفاذ شریعت سے ہمکنار دیکھیں گے یہ دعویٰ نہیں حقیقت کا اظہار ہے۔ اور اس کی بنیاد اسلام سے نوجوانوں کی وابستگی ہے۔ نئی نسل اب کسی کے فریب میں نہیں آسکتی ہے۔ وہ اسلام پر یکسو ہے اور اس کے لئے سرگرم عمل طلبہ سے زیادہ طالبات پیش پیش ہیں۔ یہی میری امیدوں کا مرکز ہیں۔ ان کی تنظیم سب سے بڑی اور فعال تنظیم ہے۔ ہم ہسپتالوں میں، سماجی بہبود کے اداروں میں، امدادی کیمپوں میں، ریڈ کراس میں، فنون، ادب، دوا سازی کے اداروں میں، بہبود نسواں میں، تعمیری منصوبوں میں، تبلیغ میں، غیر مسلموں میں، ہر جگہ کام کر رہے ہیں۔ تحریک حرکت کا نام ہے، جمود کا نہیں۔ ہمارا ہر کارکن فعال ہے ہر شخص سیاستدان نہیں ہوتا۔ اس لئے ہم نے ہر ایک کو

سیاسی کارکن نہیں بنایا جو جس جگہ کام کر سکتا ہے، وہیں خدمات انجام دے۔ یہ ہمارا بنیادی اصول ہے ہم نے اس نئی حکمت عملی سے کمیونسٹوں کا مکمل صفایا کر دیا ہے۔ ان کے سارے نعرے ان سے چھین لئے ہیں۔ حقوق نسواں کی تحریک خود ہماری خواتین نے چلائی ہے۔ مزدوروں کے حقوق کے اصل علمبردار ہم ہیں۔ پولیس کو مکمل آزادی ہم نے دلائی ہے۔ اب یہاں دینی فضا اتنی سازگار اور ہر طرف چھائی ہوئی ہے کہ کمیونسٹوں کے لئے اپنی تنظیم کا نام لینا مشکل ہوگیا ہے۔ وہ اب ڈیموکریٹس (DEMOCRATES) کے نام سے کام کر رہے ہیں مگر ہمارے کارکن ان کا مسلسل تعاقب کر رہے ہیں۔ وہ پوچھتے ہیں کہ تمھارا جمہوریت سے کیا تعلق؟ تم ایک جابرانہ نظام کے علمبردار ہو۔ تمھارے کس ملک میں جمہوریت ہے؟ اس کی نشاندہی تو کرو۔ یہ لوگ بغلیں جھانکنے لگتے ہیں۔ نظریاتی محاذ پر ہم ہر جگہ انھیں شکست دے چکے ہیں۔

جناب حسن ترابی نے برطانوی پارلیمانی نظام کے طریق انتخاب سے متعلق میرے ایک سوال پر کہا کہ ڈیگال کا یہ اعتراض درست ہے کہ اس طریق انتخاب میں حقیقی اکثریت نہیں بلکہ اقلیت اکثریت کا روپ اختیار کر کے حکومت پر قابض ہو سکتی ہے۔ اس لئے ہم بھی متناسب نمائندگی کے اصول پر غور کر رہے ہیں۔ ہم نے ابھی اس کا باقاعدہ مطالبہ نہیں کیا۔ ممکن ہے آئندہ انتخابات کے موقع پر اسکا مطالبہ کریں۔

افغانستان کے بارے میں جناب حسن ترابی نے کہا کہ مجاہدین نے پوری ملت اسلامیہ کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے اور اپنے اسلاف کی شجاعت کی یاد تازہ کر دی ہے۔ انھوں نے روسی توسیع پسندوں کو اچھا سبق دیا ہے اور ان سے جارحیت کی بھاری قیمت وصول کی ہے۔ اس کے لئے وہاں سے فرار ہونے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں۔ ایران عراق جنگ کے بارے میں انھوں نے کہا کہ جب تک ایران اپنی سرزمین سے عراقی فوجیوں کو نکالنے کے لئے کارروائی کرتا رہا ہم اس کا ساتھ دیتے رہے۔ اس کی حمایت کرتے رہے لیکن جب سے اس نے عراق میں اپنی کارروائیوں کا آغاز کیا ہے ہم نے اس کی حمایت ترک کر دی ہے مجھ سے ایک روز ایرانی سفیر نے کہا کہ آپ اب خاموش کیوں ہیں؟ میں نے کہا آپکے حق میں میری خاموشی ہی بہتر ہے۔ میں جارحیت کی مذمت ہی کر سکتا ہوں حمایت نہیں۔ انھوں نے کہا کہ پوری مسلم دنیا ایران کے ساتھ تھی مگر اس نے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے خود کو یکہ و تنہا کر لیا ہے اور اب کسی حمایت میں کہیں سے آواز بلند نہیں ہوتی۔ حسن ترابی نے ایران عراق جنگ پر گہرے دکھ کا اظہار کیا اور کہا کہ برادر کشی کی اس جنگ میں ہمارا خون نالیوں میں بہہ رہا ہے اور ہمارا سرمایہ یہودیوں کی تجوریوں میں جا رہا ہے۔ خدا جانے اس خسارے اور خود کشی کا احساس کب ہوگا؟

اسرار عالم - دہلی

قائد

"جناب اسرار عالم دہلی کا یہ دوسرا مضمون ہے جو پہلے سلسلے کی ہی ایک کڑی ہے۔
ان کا اس سلسلے کا پہلا مضمون "نصب العین" جنوری و فروری ۸۰ء میں شائع ہو چکا ہے۔"

(ادارہ)

قائد کی تعریف

تحریکی عمارت جن دو ستونوں کے سہارے کھڑی ہوتی ہے ان میں پہلا نصب العین اور دوسرا قائد ہوتا ہے۔ کسی تحریک اسلامی کا آغاز کرنے اور اسے مقصد وجود تک لے جانے والے انقلابی محرکات کا سرچشمہ قائد کا وجود ہوتا ہے۔ معاشرتی زندگی میں وہ بی نقطۂ نگاہ کی طرح ظاہر ہوتا ہے جس طرح تحریک اسلامی ابتداء سے حصول مقصد تک کبھی اپنے نصب العین سے اغماض برتتی ہے نہ اسے غیر ضروری اور ثانوی قرار دیتی ہے اور نہ ہی اس سے صرف نظر کر سکتی ہے ٹھیک اسی طرح تحریک کے لئے قائد سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں۔ جس طرح نصب العین سے انکار تحریک سے انکار ہے اور نصب العین سے عداوت تحریک سے عداوت ہے بعینہٖ قائد سے انکار تحریک سے انکار اور قائد سے عداوت تحریک سے عداوت ہے۔ انسانی معاشرے میں جب کسی وقت خاص میں تحریک اسلامی برپا ہو تو قائد نصب العین عکسی و مرئی کا مثبت وجود ہوتا ہے جو قائد تحریک اسلامی کے نصب العین عکسی و مرئی کا مثبت وجود نہ بن سکا اس کا عدم اور وجود برابر ہے۔ اسی طرح جو تحریک اسلامی اپنے قائد کو اپنے نصب العین عکسی و مرئی کا مثبت وجود نہ بنا سکی اس کا عدم اور وجود برابر ہے۔

تحریک کی غایت

مختصراً تحریک کی غایت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ موجود کو معدوم اور معدوم کو موجود بنانے کے لئے معرض وجود میں آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صالحیت دنیا میں اگرچہ کم و بیش ہمیشہ رہی لیکن تحریک اسلامی کی تاریخ غیر منفصل نہیں۔ کچھ فصل کی مدت تھوڑی ہوتی تو کبھی طویل۔ تحریک اسلامی باطل کو مٹانے اور اس کی جگہ نظام عدل قائم کرنے کے لئے وجود میں آتی ہے۔ کسی تحریک اسلامی کے لئے ممکن نہیں کہ وہ باطل کو مغلوب اور نظام باطل کو معدوم کئے بغیر اپنے مقصد وجود تک پہنچ جائے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ حق کو غالب اور نظام

عدل کو برپا کرنے میں کامیاب ہو جائے اور باطل مغلوب اور نظام باطل معدوم ہونے سے رہ جائیں اس لئے کہ کسی خطۂ خاص میں بیک وقت حق و باطل دونوں غالب یا دونوں ہی مغلوب ہوں اصولی اور عقلی طور پر ایک امر محال ہے۔ لہٰذا تحریک اسلامی کی غایت مثبت طور پر اگر نظام عدل قائم کرنا بتائی جائے تو یہ ایک امر واقعہ ہے۔

نمود کی نازکی

مندرجہ بالا سطور سے یہ نکتہ مبرہن ہو گیا ہوگا کہ یہ کام کس قدر مشکل اور دشوار ہے۔ کسی مضبوط و مستحکم تعمیر کی بنیادیں اکھاڑ کر اس کی جگہ دوسری عمارت تعمیر کرنا یقیناً ایک دشوار عمل ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ وہ عمارت ویران نہ ہو بلکہ اس پر جابر اور دیو ہیکل افراد کا قبضہ ہو جو اسے زمین بوس ہونے دینے کے لئے کسی صورت راضی نہ ہوں۔ یوں بھی عدم کا ظہور ہمیشہ کربناک ہوا کرتا ہے۔ جبکہ تحریک اسلامی کی غایت ہی یہ ہے کہ وہ نظام عدل کو جو فی الواقع معدوم محض ہوتا ہے اس طرح برپا کرنے کی سعی و جہد کرے کہ باطل اپنے سارے جبر و قہر کے باوجود اس کے لئے جگہ خالی کرنے کو مجبور ہو جائے یہ کام سخت جانکاہی کا متقاضی ہے۔ اور یہی وہ صورتحال ہے جس میں تحریک اسلامی کو برپا کرنے اور منزل مقصود تک پہنچانے کے لئے قائد کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن تحریک اسلامی کا اپنا خاص مزاج ہے۔ یہاں قائد کا ایسے شخص کا نام نہیں جسے قیادت کے لئے کہیں سے ڈھونڈ کر لایا جائے بلکہ قائد خود تحریک بن کر اٹھتا ہے۔ قائد وہ پہلا شخص ہے جس کے ذہن و فکر میں تحریک برپا ہوتی ہے اور جب نصب العین اس کے رگ و پے میں اس قدر سرایت کر جائے کہ نصب العین کے حصول کے سوا اس کی حیات کا کوئی معنی نہ رہ جائے تو وہی شخص خود تحریک بن کر اٹھتا ہے۔ وہ خود بیدار ہوتا ہے اور دوسروں کو مکمل طریقے سے بیدار کرتا ہے۔ وہ خود دیوانہ وار اپنے نصب العین کی طرف لپکتا ہے اور دوسروں کو بھی اسی جانب بلاتا ہے۔

تحریک کے برپا ہو جانے کے بعد اس کی بظاہر مخصوص ہیئت دیکھ کر ایک خاص قسم کی غلط فہمی ہو جایا کرتی ہے۔ اول یہ کہ نصب العین اور قائد دو بالکل الگ چیزوں کے نام ہیں اور دوم یہ کہ ترتیب کے لحاظ سے نصب العین کو اولیت حاصل ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ کسی مخصوص زمان و مکان میں نصب العین اور قائد ناقابل انفکاک ہیں۔ اور دوسری بات یہ کہ حقیقت واقعہ کے

سو کچھ اور نہیں کہ عملی اور فکری طور پر نصب العین کو اولیت دیتے ہوئے عملی طور پر قائد کو اولیت حاصل ہوتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ باعتبار نصب العین اور قائد کا ارتباط ان منتہاؤں کو پہنچا ہوتا ہے کہ قائد سے نصب العین کی اور نصب العین سے قائد کی علیحدگی کا تصور محال ہے۔ اس کی اعلیٰ و اکمل مثالیں حضرت انبیاء علیہم السلام کے یہاں دیکھی جا سکتی ہیں۔

خصوصی صورتحال

تحریک اسلامی جو عمل انقلاب کا علمبردار ہے زمین کے کسی خطے میں اسی وقت نمودار ہوتی ہے جب وہاں حق مغلوب ہو اور فکری و معاشرتی (جس میں زندگی کے تمام شعبے داخل ہیں) طور پر شکست یعنی دو طرفہ کا دور ہو۔ کسی عہد میں تحریک اسلامی کا نمودار ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ عصری نظام باطلانہ اور طاغوتی ہے اور جب تک وہ تحریک اسلامی اپنے نصب العین کو حاصل نہیں کر لیتی اس وقت تک سارا نظام عملاً باطلانہ ہی رہتا ہے۔ ایسا ہونا عملاً ناممکن اور عقلاً محال ہے کہ تحریک اسلامی اپنے نصب العین کا حصول بھی نہ کر پائے اور نظام وقت باطلانہ سے عادلانہ ہو جائے۔

باطلانہ نظام میں تحریک اسلامی کا نمودار ہونا گویا سخت تاریکی میں روشنی کی کرن کے اچانک پھوٹ پڑنے کے مانند ہے۔ تاریکی وہ ماحول سخت اور کربناک ہونے کے ساتھ ساتھ انسانیت کے لئے جابرانہ ہوتا ہے جس کے تلے انسانیت کراہ رہی ہوتی ہے۔ معاشرے میں چند لوگ داد عیش دے رہے ہوتے ہیں اور انسانوں کا بڑا طبقہ ظلم کی چکی میں پس رہا ہوتا ہے۔ پوری فضا کربناک ہوتی ہے۔ اس تاریکی، بوجھ اور کربناکی کا بنیادی سبب دراصل وہ غیر عادلانہ نظام ہے جو اس خطے میں برپا ہوتا ہے۔ عادلانہ نظام کی پامالی کے بعد غیر عادلانہ نظام وجود میں آتا ہے جسے متکبرین اور قوم کے بااثر افراد اپنے نفس کی تسکین کے لئے برپا کرتے ہیں۔ قوانین وضع کرتے ہیں۔ خدا کے قوانین کو پامال کر دیتے ہیں۔ وہ انسانی معاشرے کو اور دوسرے خلق خدا کو غلام بنا لیتے ہیں جس کے نتیجے میں ایک ایسا وحشی معاشرہ وجود میں آتا ہے جس میں کوئی فرد محفوظ و مامون نہیں رہ پاتا اور پورا معاشرہ زہریلے دھوئیں کا شکار ہو جاتا ہے۔

تحریک اسلامی ایسی ہی فضا میں آنکھیں کھولتی ہے۔ تاریخ انسانی میں یہ زہریلی فضا ازل سے پیدا نہیں ہو جاتی۔ زمین پر انسانی معاشرہ حق اور عدل پر قائم ہوا لیکن جب نفسانی خواہشات

نے زور پکڑا انسانوں کو اس قدر مغلوب کر دیا کہ انھوں نے ربانی قوانین الگ رکھ دیئے اور من مانی کرنے لگے۔ یہ گویا طاغوتی نظام کی ابتدا تھی۔ اور ہر عہد میں جب حق مغلوب ہو جاتا ہے تو سارا نظام کی عمارت کھوکھلی ہو جاتی ہے۔ باطلانہ نظام میں نمودار ہونے والی تحریک اسلامی کا پس منظر صالحات و صالحات کی وہ روایت اور تاریخ ہے جو ازل سے چلی آ رہی ہے۔ صلاح و صالحیت کا یہی داعیہ جب کہ ہر فطرتاً غیر مرئی محسوس یا غیر محسوس ذریعہ سے انسانی قلب پر منعکس ہوتا ہے تو تحریک اسلامی بنکر نمودار ہوتا ہے۔ جس شخص کے قلب پر اس کا اس درجہ انعکاس ہو کہ اس کا حصول مقصد حیات بن جائے اور اسی کے لئے جینے اور مرنے کا عزم اس کی زندگی کا حاصل ہو تو وہ اسے برپا کرنے کو کھڑا ہو جاتا ہے اور یہی شخص قائد ہوتا ہے۔ قائد وہ پہلا فرد ہے جو اپنے اندر تحریک کا تخم بھی رکھتا ہے اور خود تحریک کا حاصل بھی ہوتا ہے۔ تحریک کا وہ ابتدائی مرحلہ بڑا ہی عجیب و غریب ہوتا ہے جب تحریک گویا یک نفری ہوتی ہے۔

تحریک اسلامی کا آغاز باطلانہ نظام کی تنگ و تاریک فضا میں ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں اس بات کا اندازہ لگانا چنداں دشوار نہیں کہ باطل کے جبر و قہر کے درمیان تحریک اسلامی کیلئے اپنے نصب العین کا حصول کس قدر دشوار اور بظاہر ناقابل تصور ہو سکتا ہے۔ تحریک اسلامی ابتداءً نصب العین کے حصول کی گھڑی تک باطلانہ نظام کے مقابلے میں ایمان کے علاوہ ہر اعتبار سے بے بضاعتی کا شکار ہوتی ہے۔ یہ صورتحال تحریک اسلامی کی خصوصیت بھی ہے اور فطری نمو کی منطقی کیفیت بھی۔ ایسے دور میں تحریک اسلامی ہر اعتبار سے Constraints سے دوچار ہوتی ہے۔ افراد، صلاحیت، طاقت اور وسائل کسی پہلو سے ایسا ممکن نہیں ہو سکتا کہ ان Constraints کا سامنا نہ ہو۔ ایسے گھٹا ٹوپ اندھیرے اور بے سروسامانی میں قائد مینارۂ نور کی مانند ہوتا ہے۔ یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ تحریک اسلامی کا اپنا مخصوص طریقہ کار ہے۔ نہ تحریک اسلامی الل ٹپ برپا کی جا سکتی ہے اور نہ ہی من مانے ڈھنگ سے چلا کر کامیاب بنائی جا سکتی ہے۔ بلکہ یہ اپنے مخصوص طریقے سے معرض وجود میں آتی ہے اور اسی انداز میں آگے بڑھ کر منزل مقصود تک لے جائی جا سکتی ہے۔ آئندہ قیامت تک برپا ہونے والی تمام تحریکات اسلامی کے لئے وہ مخصوص طریقہ کار قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ثابتہ میں بالتفصیل موجود ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ابتداءً جب تحریک اسلامی صرف ایک فرد پر مشتمل ہوتی ہے اور وہ شخص قائد کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہوتا تو اسے عملاً انسانی معاشرے میں اس اعتبار سے اولیت حاصل ہوتی ہے۔ ایسی صورت حال میں تحریک اسلامی کا مخصوص مزاج یہ بھی ہے کہ وہ نصب العین کے مکمل حصول کے دن سے قبل اور بالخصوص کے ہمہ گیر عدوان سے پہلے اپنے constraints کو غیر فطری اور غیر عادلانہ طریقے سے ختم کرنے کی کوشش نہیں کرتی بلکہ اگر ایسی کوئی صورت کسی خارجی عنصر کے سبب پیدا بھی ہو جائے تو اسے یکسر رد کر دیتی ہے اور کسی طرح تحریک اسلامی کو اس کی اجازت نہیں ہوتی کہ وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ اس صورت حال سے استفادہ کرے۔ یہ تمام باتیں قائد کو بے حد و حساب اہمیت کا حامل اور موثر بنا دیتی ہیں۔ اور قائد کی غیر معمولی اہمیت اور استحقاق کا بیک وقت انکار کرنا نصب العین بلکہ پوری تحریک اسلامی کے انکار کے مصداق ہے۔

قیادت کی مخصوص ضرورت

آغاز سے حصول نصب العین تک تحریک اسلامی میں نفس نصب العین کے علاوہ جو چیز مستقل بالذات اور غیر متبدل ہوتی ہے وہ قائد ہے۔ ابتداء سے نصب العین تک کا مرحلہ قائد کی حیات کا سخت ترین مرحلہ ہوتا ہے۔ گویا تحریک اسلامی کے برپا ہونے سے کر نظام عدل کے غالب ہونے تک قائد سب سے زیادہ آزمائش سے گزرتا ہے۔ اس کے لئے انسانی جہات کا بغاوت کی راہ پر چل کر ضائع ہو جانا کرنا کسی سے عادت کی راہوں سے ہٹ کر انہیں سواء السبیل پر لانے کی جد و جہد اس سے کم تکلیف دہ نہیں۔ تحریک اسلامی اس پورے مرحلے میں خدا کی ذات کے علاوہ جو اصلاً ذاتی عنصر ہے جس فرد بشر پر تکیہ کرتی ہے وہ خود قائد کی ذات ہے۔ اس صورت حال میں قیادت کے تقاضے سخت دشوار اور گراں بار ہیں۔ لیکن قائد کے رگ و پے میں نصب العین کے حق ہونے اور اسے پانے کا یقین اس درجہ ہوتا ہے کہ اس راہ کی تمام صعوبتوں کے باوجود وہ تحریک اسلامی کو پوری ہمت اور عزم سے آگے لے جاتا ہے۔

ظاہری بات ہے کہ جہاں ایک طرف طاغوتی نظام اپنی قہرمانی دکھا رہا ہو اور دوسری طرف حق کا گروہ بے انتہا بے سر و سامانی اور بے وقعتی کا شکار ہو نظام عدل کو قائم کرنا کس قدر دشوار ہے۔ یہ خواب معمولی اور عام پرانی کی کوششوں سے شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ ایسی

حالت میں قائد اللہ کی دی ہوئی صلاحیتوں سے کام لے کر منظم اور منصوبہ بند طریقے سے آگے بڑھتا ہے۔ قائد کے کام کم از کم چھ نکات پر مشتمل ہوتے ہیں۔

(۱) منصوبہ بندی (۲) تنظیم (۳) ہدایت (۴) ضبط (۵) تحریض (۶) رابطہ

تحریک کا ظہور اللہ کی سنت اور اس کی مشیت کے مطابق ہوا کرتا ہے۔ جب باطلانہ نظام میں کوئی فرد اللہ کی ہدایت و حکمت کا طالب ہو اور اس کی منشا کی تکمیل کے لئے جد و جہد کرنے کی آمادگی رکھتا ہو تو اللہ اس کے قلب کے اخلاص و احق ہونے کی بنیاد پر اسے اپنی مخصوص حکمت اور نصرت سے نواز دیتا ہے۔ یہ گویا اس عطا کردہ حکمت و نصرت کا نتیجہ ہے کہ وہ شخص اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک بظاہر غریب نصب العین لے کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ اسی وقت اسی قسم کے دعوے لے کر کچھ اور لوگ بھی کھڑے ہو جائیں۔ لیکن ایسے دعوے وقت کے ساتھ ساتھ آزمائش کی سان پر چڑھ کر اپنی حقیقت خود بتا دیتے ہیں۔ تحریک اسلامی کا نادرہ وہ خوش نصیب فرد ہے جسے اللہ اپنی مخصوص حکمت سے نواز دیتا ہے۔ یہ مخصوص حکمت وہ نعمت ہے جس کے تحت دوسری بہت ساری چیزوں کے علاوہ مخصوص علم و وجدان اور قوت تجدید نصیب ہوتا ہے۔ مثلاً اس زمان و مکان میں مشیت ربانی کا واضح اور پختہ شعور، نصب العین اور اس کے حصول کی راہوں کا علم، باطلانہ نظام کے تجزیہ کی غیر معمولی قوت، تفقہ فی الدین وغیرہم۔

اللہ کی عطا کردہ ان حکمتوں کے سبب قائد میں غیر معمولی صلاحیت پیدا ہو کر راسخ ہو جاتی ہے اور یہی صلاحیتیں تحریک میں کر برگ و بار لاتی ہیں۔ ان تمام خوبیوں میں سب سے نمایاں نکتہ اسلام کی حقانیت اور قابل عمل ہونے کا یقین ہے۔ یہ یقین اس درجہ بالیدہ اور نکھرا ہوا ہوتا ہے کہ تحریک کی راہوں کی سخت ترین آزمائشیں بھی اس کا راستہ روک نہیں سکتیں۔ طاغوت کا وحشیانہ سلوک، اور عامۃ الناس کی بے پروائی اس کے بڑھتے قدموں کو متزلزل نہیں کر سکتی۔ اسے اس قدر یقین ہوتا ہے کہ حق کے سوا کچھ اور اس کا قلب قبول نہیں کرتا۔ اس کے اندر غیر معمولی عزیمت پیدا ہو جاتی ہے۔ سخت سے سخت مرحلے میں بھی جو شکل سے مجروح ہوتی ہے۔ وقت کے فراعین اسے مجبور کرنے لے بھی بے حوصلگی کا شکار نہیں کر سکتے۔ اسے اللہ تعالیٰ

اس قدر بصیرت عطا فرماتا ہے کہ طاغوتی قوتیں اسے فریب نہیں دے سکتیں۔ وہ خواہ کسی قسم کا دام ہمرنگ زمین کیوں نہ بچھا دیں قائد اس سے صاف بچ نکلتا ہے۔ اس کا قلب باطل کی نفرت سے لبریز اور اس کے لئے بے لچک ہوتا ہے۔ قائد کسی مرحلے میں بھی طاغوت سے مداہنت کا رویہ اختیار نہیں کرتا۔ اور جب تک وہ اللہ کی دی ہوئی ان نعمتوں کا اسکی مرضی کے مطابق ٹھیک ٹھیک استعمال کرتا رہتا ہے۔ اللہ کی نصرت اسے حاصل ہوتی رہتی ہے جس طرح نصب العین واحد، واضح، نمایاں، غیر مبہم، حدید، بے لچک اور مکمل ہوتا ہے۔

قائد کی حیثیت

زمین پر ظہور نسل آدم سے لے کر قیامت تک برپا ہونے والی تحریکات اسلامی کے قائدین کی صرف دو حیثیتیں ہو سکتی ہیں۔ نوعی اور وظیفی۔ جہاں تک نوع کا معاملہ ہے تو وہ دو اقسام کے ہو سکتے ہیں اولاً نبی قائدین ثانیاً غیر نبی قائدین۔ بعثت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب تاقیامت صرف غیر نبی قائدین ہی تحریکات اسلامی برپا کریں گے یہ دونوں حیثیتیں نوع کے اعتبار سے بالکل الگ الگ ہیں۔

دوسری حیثیت وظیفی ہے۔ جہاں تک وظیفی حیثیت کا معاملہ ہے تو اگرچہ نبی اور غیر نبی قائدین کے مابین معیار کے لحاظ سے آسمان و زمین کا فرق رہتا ہے لیکن دونوں ایک ہی دائرے کے اندر ہوتے ہیں منطقی اور عقلی طور پر جہاں یہ بات سمجھ میں آتی ہے وہیں قرآن و سنت میں بھی بہت واضح اشارات موجود ہیں جن کا ذکر ان شاء اللہ آئندہ آئے گا۔

نبی اور غیر نبی قائدین اس اعتبار سے مختلف ہو سکتے ہیں کہ خدا کے نزدیک ان دونوں کے انتخاب کا طریقہ جداگانہ ہوا کرتا ہے لیکن جہاں تک عامۃ الناس کا معاملہ ہے تو ان کے مابین ان دونوں کے ظہور کی کیفیت فطری اور طبعی ہوتی ہے اور وہ وظیفی طور پر یکساں ہوتے ہیں یہ صحیح ہے کہ نبی قائدین بظاہر دعوی کے ساتھ منصۂ شہود پر آتے ہیں اور غیر نبی قائدین دعوی کرنے کے اہل نہیں ہوتے لیکن بایں ہمہ جو چیز دونوں میں مشترک ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ دونوں میں سے کوئی بھی عامۃ الناس کے ذریعہ منتخب نہیں ہوتا۔ دونوں طرح کے قائدین تحریکات اسلامی کا انتخاب نہیں ہو سکتا بلکہ کوئی ایسا انتخاب عقلی اور منطقی طور پر کرنے سے محال ہے۔ دونوں ہی،

تحریک بن کر ظاہر ہوتے ہیں تحریک لے کر اٹھتے ہیں اور لوگوں کو فطری طور پر ان کا عرفان نصیب ہوتا ہے۔ ایسے قائدین کا اپنے ہونے والے متبعین سے دو مرحلوں میں ربط قائم ہوتا ہے اور استوار رہتا ہے۔ یہ دو مرحلے عرفان اور تسلیم ہیں۔ سب سے پہلے لوگوں کو ان کا عرفان نصیب ہوتا ہے۔ ہزاروں اور لاکھوں افراد جو مختلف صلاحیتوں اور خصوصیتوں کے مالک ہوتے ہیں ان کے درمیان رہتے ہوئے قائد پہچان لیا جاتا ہے۔ یہ عمل بھی فطری اور اکثر و بیشتر غیر محسوس طریقے سے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ غیر نبی قائدین تو الگ رہے نبی قائدین تک کا جو کہ بظاہر دعوی کے ساتھ منصۂ شہود پر آتے ہیں لوگوں کو اکثر و بیشتر ابتداً عرفان نصیب نہیں ہوتا۔ اسکے اسباب باطل زاد و طاغوتی ماحول میں پروان چڑھی ہوئی عقل اور ناقص علم ہیں جو اس کا فیصلہ کرنے میں اکثر فریب کھا جاتے ہیں کہ آیا اس شخص کا دعوی درست بھی ہے یا نہیں۔ آنکھوں کے سامنے ہوتے ہوئے بھی انھیں بسا اوقات اس شخص میں یا تو کیڑے نظر آتے ہیں یا وہ انکی عقل میں فرشتہ صفت نہیں ہوتا جس کی وہ توقع رکھا کرتے ہیں۔ اور ایک کثیر تعداد ایسے بدقسمت افراد کی ہوتی ہے جو اس وقت تک اسے پہچان نہیں سکتی جب تک یا تو وہ غالب نہ ہو جائے یا چلا نہ جائے یا خدا کا عذاب نہ آجائے۔ وہیں کچھ ایسے افراد بھی ہوتے ہیں جن کے قلوب اور دماغوں میں فطری اور صالح میزان موجود ہوتا ہے۔ تو وہ اس تاریک فضا میں بھی اس نبی قائد کو پہچان لیتے ہیں۔ ظاہر ہے جب نبی قائدین کا یہ حال ہو سکتا ہے تو غیر نبی قائدین کا عرفان کتنا دشوار ہے۔

غیر نبی قائدین تحریک کا معاملہ یہ ہے کہ ہزاروں اور لاکھوں افراد کے درمیان رہتے ہوئے اور کام کرتے ہوئے لوگوں کو ان کا عرفان نصیب ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اب اس عرفان کے لئے جو فطری اور صالح میزان موجود ہے وہ قرآن و سنت کے سوا کچھ اور نہیں۔ لہذا ایسے افراد قرآن و سنت کے میزان پر تل کر ہی پہچانے جا سکتے ہیں۔

عرفان کے بعد دوسرا مرحلہ تسلیم کا ہوتا ہے۔ جن لوگوں کے قلوب میں اس شخص کی تحریک اور اس کے نصب العین کی حقانیت کا داعیہ اتنا مضبوط اور قوی ہو جائے کہ وہ اپنی جان و مال اس کے حوالے کریں اور جس کوشش میں وہ شخص لگا ہوا ہے اس کے لئے یکسو ہو جائیں تو یہی

تسلیم ہے۔ ایسی حالت میں وہ اس کی رہنمائی کو سر بسر تسلیم کر لیتے ہیں۔ یہی وہ فطری عمل ہے جس کے ذریعہ ایک تحریکی اجتماعیت وجود میں آتی ہے۔

قائد سے تعلق

قائد کا تعلق تحریک اور تحریکی افراد سے اتنا ہی ہمہ گیر ہوتا ہے جتنا نصب العین کا۔ یہ بات بالکل ابتدا میں عرض کی گئی تھی کہ انسانی معاشرے میں جہاں کسی وقت مخصوص میں تحریک اسلامی برپا ہو قائد نصب العین عملی و مرئی کا ثبت وجود ہوتا ہے ظاہر ہے قائد کا یہ تعلق نہ صرف یہ کہ غیر معمولی ہے بلکہ ہمہ گیر بھی۔ یہی سبب ہے کہ قائد تحریک اور تحریکی افراد کے درمیان ایک ایسا تعلق ہوا کرتا ہے جو ناقابل انفکاک ہے۔ ان میں درجے کے اختلافات اور بعض مخصوص صورتوں میں شدت و نرمی تو آسکتی ہے لیکن دنیا کی کوئی رکاوٹ خواہ وہ طبعی ہو یا سیاسی جغرافیائی ہو یا معاشرتی یا معاشی دونوں کو غیر مربوط نہیں بنا سکتی۔ قائد تحریک اسلامی کا اس زمان و مکان میں اسی درجے میں ایک علامت ہوتا ہے جس درجے میں نصب العین۔ کوئی تحریک اسلامی اس کیفیت سے عاری ہو کر وجود میں آجائے عقلی طور پر محال ہے۔ تاہم ایسا اگر ہو بھی جائے تو کچھ زیادہ دیر نہیں لگتی کہ اس کے تانے بانے بکھرنے لگتے ہیں۔ ملکہ وہ تحریک یا تو بہت جلد ختم ہو جاتی ہے یا منافقین کا مجموعہ بن جاتی ہے جس میں مخلصین بے دست و پا ہو جاتے ہیں یا اگر ان دونوں میں سے کوئی بات بھی نہ ہوئی تو تحریک بے جان اور بے معنی ہو کر یا ادارہ بن کر بالآخر باطل نظام کا آلہ کار بن جاتی ہے۔

جس طرح تحریک سے منسلک افراد میں نصب العین سے والہانہ محبت اور اس سے گہری وابستگی پائی جاتی ضروری ہے بلکہ ناگزیر ہے اسی طرح ان میں قائد سے والہانہ محبت اور اس سے گہری وابستگی کا پایا جانا ضروری بلکہ لازمی ہے۔ یہ والہانہ محبت اور گہری وابستگی قائد کا محض حق نہیں بلکہ تحریک کی ناگزیر ضرورت ہے۔ تحریک جس عمل کا نام ہے اور وہ جن نامساعد اور جاں گداز حالات میں اور جن بے سروسامانیوں کے ساتھ اپنے نصب العین کا حصول کرنے کی تگ و دو کرتی ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس سے وابستہ افراد کا اپنے قائد سے والہانہ ربط ہو۔

یہاں معترضہ کے طور پر اس بات کا اعادہ غیر ضروری نہیں ہوگا کہ تحریک اور ادارے کے قائدین یکساں نہیں ہوتے۔ دونوں الگ الگ حالات اور تقاضوں کی پیداوار ہوتے ہیں۔ لہٰذا دونوں میں اصولی اور اساسی فرق ہوتا ہے۔ یہ فرق انکی زندگی، کارکردگی اور اپنے

متعلقین سے تعلق کے ہر پہلو میں جداگانہ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ انکی شدت یعنی Intensity تک جداگانہ ہوتی ہے۔ تحریکی قائد کا ہدف موجود کو ختم کر کے عدم کو وجود میں لانا ہے تو ادارہ جاتی قائد کا ہدف موجود کو باقی رکھنا اور اسے ترقی دینا ہے۔ ظاہر ہے ان دونوں میں کوئی چیز مشترک نہیں۔ لہٰذا عام زندگی میں ان دونوں کے قائدین بظاہر ایک ہی جیسے ناموں اور القاب کے حامل کیوں نہ ہوں ان میں آسمان و زمین کا فرق ہوتا ہے۔

کسی ادارے سے منسلک افراد کا تعلق اپنے قائد سے معاملہ جاتی، اصطلاحی، کاروباری، قانونی، غیر جذباتی، تعقلی، غیر مستقل اور محدود معنوں میں اطاعتی ہوتا ہے۔ جبکہ ٹھیک اسکے بالعکس کسی تحریک سے منسلک افراد کا اپنے قائد سے تعلق اطاعتی، تسلیمی، تحبی، جذباتی اور مستقل ہوتا ہے۔ جو تعلق کسی ادارے سے منسلک افراد کا اپنے قائد سے ہوتا ہے وہ تعلق تحریک کے قائد سے ہونا مضحکہ خیز ہے۔ ٹھیک اسی طرح جو تعلق کسی تحریک سے منسلک افراد کا اپنے قائد سے ہوتا ہے وہ تعلق ادارے کے قائد سے ہونا تباہ کن ہے اور اگر ایسا ہو جائے تو تحریک راکھ کا ڈھیر اور ادارہ خدائی کا دعویدار بن جائیں گے۔

ادارے میں شخصیت کا غیر معمولی اثر اور تعلق خاطر اور شخصیت پرستی اور انانیت پیدا کرتا ہے اور دنیا میں اس سے زیادہ بری چیز کوئی اور نہیں جس کے مضر اثرات سے بعض اوقات پوری خلق خدا پریشان ہوتی ہے۔ لیکن اس کے بالعکس تحریک میں قائد کا غیر معمولی اثر اور اس سے والہانہ تعلق کشتی تحریک کو مخالف قوتوں کے سمندر میں تھپیڑے سہنے کا عزم اور بالآخر ساحل مراد تک پہنچنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔

قائد کا وظیفہ اور اسکی مجتہدانہ کاوش

تحریک اسلامی کے قائد کا وظیفہ وہ اہم باب ہے جس کا شعور اور اسکی ادائیگی کا بے پناہ جذبہ و عزم تحریک اسلامی کی کامیابی میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ اس بات کا اولین مظہر خود قائد کا تحریک بن کر اٹھنا ہے۔ قرآن نے بڑی صراحت کے ساتھ قائد کے وظیفے سے گفتگو فرمائی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور ان کی سنت ثابتہ جسکی آئینہ دار ہیں یہ ایک الگ موضوع ہے جس کا ذکر یہاں طوالت کا باعث ہوگا جو خالی از تکلف نہیں۔ ہاں یہ

بات ہمیشہ یاد رکھنے کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعثت مبارکہ کے بعد اب تا قیامت اس وظیفہ کا شعور، اس سے ادا کرنے کا جذبہ، عزم اور اس سلسلے میں کی جانے والی کاوشوں میں بھی مجتہدانہ صلاحیت اللہ کے فضل و کرم سے قرآن و سنت میں غیر معمولی غور و فکر کے نتیجے میں ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔ اب خود قائد کے لئے معرفت کا ذریعہ جہاں قرآن و سنت میں غیر معمولی غور و فکر اور اس سے استفادہ کی کوشش ہے تو وہیں عامۃ الناس کے لئے بھی قائد کے عرفان اور اس کی مجتہدانہ اور حکیمانہ جدوجہد کی سمجھ کا ذریعہ بھی قرآن و سنت ہی ہیں۔

اب جہاں تک وظیفوں کی ادائیگی کا سوال ہے قائد ان کی ادائیگی کے لئے چھ نکات یعنی منصوبہ بندی، تنظیم، ہدایت، ضبط، تحریض اور ربط کا لحاظ رکھتا ہے۔ لیکن جہاں ایک طرف طاغوتی نظام سدِ راہ بنتا ہے وہیں بعض اوقات قائد کے لئے ایسے ماحول میں جہاں صلاح و صالحیت کی روایت کے مطابق موجود ہوتے ہیں جو عملاً طاغوت کے آلۂ کار کی حیثیت سے کام کرتے ہیں، ایک خاص قسم کی رکاوٹ کھڑی کرتے ہیں۔ یہ دشواری اور رکاوٹ سخت پریشان کن ہوتی ہیں۔ اس کی ضرب اور ریشہ دوانیاں طاغوتی نظام کے ہراول دستے کا کام کرتی ہیں۔ یہ سب یوں تو ہر دور میں قائد کے وظیفوں کی ادائیگی میں رکاوٹ اور اس کے عرفان میں حجاب بنتی ہیں لیکن بالخصوص ابتدائی عہد میں ان کا گاڑھا ہوا حجاب اور کھڑی کی ہوئی رکاوٹیں سخت پریشان کن ہوتی ہیں اور سوائے مخلص افراد کے عامۃ الناس کو قائد اور تحریک کا عرفان ہی حاصل نہیں ہوتا۔ دشواریاں کبھی کلامی اور کبھی فقہی موشگافیوں کی شکل میں سامنے آتی ہیں، جو اصلاً نظام عدل کے زوال آمادہ دور کی پیداوار ہوتی ہیں۔ اس کی بدترین مثالیں انبیاء بنی اسرائیل علیہم السلام کے عہد تحریک ہی میں ملتی ہیں۔

تحریکی قیادت کی مدت کار

قائد اور تحریک کا تعلق ناقابل انفکاک ہے۔ یہی سبب ہے کہ تحریک اسلامی کے قائد کی موت ہی اسے تحریکی قیادت سے الگ کرتی ہے۔ یہ بات پہلے آ چکی ہے کہ تحریک سے منسلک افراد کا تعلق اپنے قائد سے اطاعتی، تنظیمی، جذباتی اور مستقل ہوتا ہے لیکن جو بات نہایت اہم ہے وہ یہ کہ خود تحریک کا مزاج کیا ہوتا ہے اور اسی طرح تحریک کی مدت کار کیا ہوا کرتی ہے؟

جہاں تک تحریک کے مزاج کا معاملہ ہے تو تحریک ہمہ جہتی، یک زمانی اور کثیر مزاج کا حامل ہوتی ہے۔ ان تین باتوں میں جو نکتہ اہم ترین ہے وہ اس کا یک زمانی مزاج ہے۔ تحریک اس اعتبار سے یک زمانی ہوتی ہے کہ نصب العین اور قائد ایک ساتھ منظر شہود پر آ کر ساتھ چلتے ہیں اور جہاں ان دونوں کا ساتھ چھوٹ جائے وہ تحریک کے خاتمہ کا مقام ہوتا ہے۔ تحریک اسلامی نصب العین اور قائد کی حد تک کاندھا بدلتے ہوئے نہیں چلتی بلکہ نصب العین اور قائد کا ساتھ جہاں چھوٹ جاتا ہے وہیں ایک تحریک کی حیات طبیعی ختم ہو جاتی ہے اور جب کوئی دوسرا قائد اسی نصب العین کو کاندھا دیتا ہے تو وہ ماقبل کی تحریک کا تسلسل یا تتمہ نہیں بلکہ مستقل دوسری تحریک ہوتی ہے۔

اس کے بالعکس ادارہ ایک دوسری کیفیت اور کارخانے کا نام ہے۔ تحریک کے علی الرغم ادارہ تدریجی، متوالی یا متعاقبی اور مسلسل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک اسلامی کا قائد نہ تو معزول کیا جا سکتا ہے نہ اس کی تبدیلی ہو سکتی ہے اور نہ ہی ضعف، پیری یا معذوری کے سبب وہ مستعفی ہو سکتا ہے۔ یہ بات عقلاً اور نقلاً محال ہے۔

رسول اور اسکی قیادت

رسول نوع کے اعتبار سے نبی قائد ہوتا ہے لہٰذا اس کی قیادت میں دو چیزیں جمع ہوتی ہیں۔ پہلی چیز رسالتی قیادت ہے اور دوسری تحریکی قیادت۔ جہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ ہے تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت بھی انہیں معنوں میں دو حیثیتوں کی حامل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالتی قیادت مستقل، تا قیامت اور غیر منقطع ہے لیکن جہاں تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریکی قیادت کا معاملہ ہے تو وہ روحانی طور پر غیر منقطع ہونے کے باوجود طبیعی طور پر یک زمانی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس قیادت کا زمانہ دور نبوی کہلاتا ہے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالتی اور روحانی قیادت نہ صرف یہ کہ آج بھی ہمیں حاصل ہے بلکہ وہ ہمارے ایمان کا حصہ ہے لیکن ان کی تحریکی طبیعی قیادت صرف انہیں حاصل تھی جنہیں اصحاب رسول ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ جب خطۂ زمین پر کسی رسول کا وجود مبارک ہوتا ہے تو اس کی دعوت بیک وقت رسالتی دعوت بھی ہوتی ہے اور تحریکی دعوت بھی، اسی طرح اس کی قیادت رسالتی بھی ہوتی

تحریر: ڈاکٹر عبدالرحمان رافت پاشا — ترجمانی: ابو جاوید

حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ

ہماری اس کہانی کا ہیرو اصحاب رسول میں سے وہ شخص ہے جس کا نام عبداللہ بن حذافہ سہمی ہے۔ ممکن تھا کہ تاریخ اس شخص کی طرف بھی کوئی توجہ نہ کرتی اور اس کا کوئی خیال دل میں لائے بغیر اسی طرح گزر جاتی جس طرح اس سے پہلے کے لاکھوں عربوں کو نظرانداز کرتی ہوئی گزر گئی ہے۔ لیکن اسلام نے عبداللہ بن حذافہ سہمی کے لیے ان کے دو ہم عصر اور اپنے وقت کے عظیم بادشاہوں — شہنشاہ ایران کسریٰ اور شہنشاہ روم قیصر سے ملاقات کا موقع فراہم کر دیا تھا اور ان دونوں کے ساتھ ان کی ملاقات کے ساتھ ایک ایسی داستان وابستہ ہو گئی جو ہمیشہ کے لئے زمانے کی یادداشت میں محفوظ ہو چکی ہے اور جس کو تاریخ کی زبان برابر دہراتی رہے گی۔

شہنشاہ ایران کسریٰ کے ساتھ ان کی ملاقات کا قصہ سنہ ۶ ھ سے تعلق رکھتا ہے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کچھ صحابہ کے ذریعہ شاہان عجم کے پاس دعوتی خطوط ارسال فرمانے اور ان خطوط کے ذریعہ انھیں اسلام کی دعوت دینے کا ارادہ کیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مہم کے دوران پیش آنے والے خطرات کا پورا پورا اندازہ تھا۔ کیوں کہ ان قاصدوں کو ایسے دور دراز علاقوں میں جانا تھا جن سے اس سے پہلے ان کو کوئی سابقہ نہیں پیش آیا تھا۔ مزید براں یہ کہ وہ ان علاقوں کی زبانوں سے نابلد اور ان حکمرانوں کے مزاج سے بالکل ناواقف تھے۔ پھر اسی طرح یہ کہ انھیں ان کو اپنے سابقہ ادیان کو ترک کرنے، اپنے اقتدار و حکومت کے منصب سے الگ ہو جانے اور ایک ایسی قوم کے دین میں داخل ہونے کی دعوت دینی تھی جو ابھی قریب میں ان کے ماتحت رہ چکی تھی۔ یقیناً یہ ایک نہایت پرخطر سفر تھا جس پر روانہ ہونا موت کے منہ میں جانے اور اس سے زندہ و سلامت واپس آنا نیا جنم پانے کے مترادف تھا۔ اس مہم کے متوقع خطرات کے پیش نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو مشورہ کے لیے جمع کیا اور ان کے سامنے خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا: "میں تم میں سے کچھ لوگوں کو شاہان عجم کے یہاں

ہے اور تحریکی بھی۔ اور ان دونوں حیثیتوں کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص رسالتی دعوت کا اقرار کرتا ہو اور اسے قبول کرنے پر آمادہ ہو اور اس کی تحریکی قیادت کا منکر ہو۔ اسی طرح یہ بات بھی محال ہے کہ کوئی شخص کسی رسول کی رسالتی قیادت کا فرماں بردار ہو اور تحریکی قیادت کا منکر۔

جہاں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور ان سے محبت بحیثیت رسول بھی تھی اور بحیثیت قائد تحریک بھی، یہ بات کافی نہیں کہ قرآن نے جس قدر اطاعت اور محبت کا حکم دیا ہے اس کی وجہ صرف رسالت ہے اور یہ کہ ایسی اطاعت اور محبت صرف رسول کے اس منصب کا حصہ ہے جو رسالت سے متعلق ہے، بلکہ یہ اس رسول کی تحریک کی اہم ترین ضرورت بھی تھی جو اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں طاغوتی قوتوں سے نبرد آزما تھی۔

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریک اسلامی کو بعض ایسے لمحات سے بھی گزرنا پڑا جو تحریک اسلامی کی حیات کے فیصلہ کن موڑ ثابت ہوئے اور جن میں ایسے ایسے شورہائے رستاخیز بپا ہوئے کہ لمحاتی طور پر ہی سہی نصب العین کے سرے لوگوں کے ہاتھوں سے جاتے رہے اور افراتفری کی عام فضا چھا گئی۔ ایسی حالت میں صرف قائد کا وجود اس کی بصیرت اور عزم صمیم اور دوسری طرف قائد کی بے چون و چرا اطاعت اور اس سے بے پناہ محبت کا جذبہ ہی وہ ہتھیار ہیں جنھوں نے تحریک کو موت کے گھاٹ اترنے سے بچا لیا۔ بلاشبہ ایسے حالات شاذ اور وقتی ہوتے ہیں مگر ہر تحریک اسلامی کو دو ایک بار تو ان کا سامنا یقیناً ہوتا ہے۔ اور یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جیسے جیسے طاغوتی قوتوں سے کشمکش زور پکڑتی ہے اور تصادمات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے گویا تحریک اسلامی نازک دور میں داخل ہو جاتی ہے تو ایسے موڑ متواتر آنے لگتے ہیں۔ عملی طور پر ایسا بارہا دیکھا گیا ہے اور قرآن اور حیات طیبہ میں اس کی مثالیں خوب ملتی ہیں کہ بعض اوقات وقتی طور پر reason کا دامن ہاتھ سے بظاہر چلا جاتا ہے اور عام تو عام خواص کے ذہن بھی ماؤف ہونے لگتے ہیں۔ ایسی حالت میں صرف قائد ہی منارۂ نور ہوتا ہے۔ افراتفری کی عام فضا میں قطبی تارے کی رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

(بقیہ صفحہ [illegible])

سفارت پر بھیجا جا رہا ہوں۔ تم لوگ اس میں مجھ سے اختلاف نہ کرنا جیسا کہ بنی اسرائیل نے عیسیٰ علیہ السلام سے اختلاف کیا تھا۔"

جواب میں صحابہ کرام نے عرض کیا۔

"اللہ کے رسول! آپ ہم کو جہاں چاہیں بھیج دیں۔ ہم آپ کا ہر پیغام خوشی خوشی پہنچانے کے لئے تیار ہیں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملوک عرب اور شاہان عجم کے پاس اپنے خطوط پہنچانے کے لئے چھ صحابہ کو طلب فرمایا۔ ان میں سے ایک حضرت حذافہ سہمیؓ بھی تھے۔ انھیں شہنشاہ ایران کسریٰ کے ہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچانے کے لئے منتخب کیا گیا۔

حضرت عبداللہ بن حذافہؓ نے اپنی اونٹنی کو سواری کے لئے تیار کیا۔ بیوی بچوں سے رخصت ہوئے اور تن تنہا اپنی منزل مقصود کا رخ کیا اور راستے کے نشیب و فراز کو طے کرتے اور مصائب سفر کو برداشت کرتے ہوئے ایران پہنچے تو درباریوں سے کسریٰ کے ساتھ ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ اور ان کو اس خط سے بھی آگاہ کر دیا جسے وہ بادشاہ کے لئے لے کر آئے تھے۔ کسریٰ کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے اپنے دربار کی تزئین و آرائش کا حکم دیا اور اپنے تمام بڑے بڑے افسروں کو دربار میں حاضری کی ہدایت کی۔ ساری تیاریاں مکمل ہو گئیں تو اس نے حضرت عبداللہ بن حذافہؓ کو دربار میں طلب کیا۔ اس وقت ان کے جسم پر ہلکا سا کمبل اور معمولی سی عبا تھی۔ اور ان کے حلیہ سے بدوی عربوں کی سادگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ لیکن ان کا سر بہت بڑا اور قد کافی لمبا تھا اور ان کے سینے میں عظمت اسلام اور دل میں عزت اسلام کی آتش جوالہ شعلہ زن تھی۔ کسریٰ نے ان کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو ایک درباری کو اشارہ کیا وہ خط ان کے ہاتھ سے لے لے۔ مگر حضرت عبداللہؓ نے کہا کہ نہیں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ میں یہ خط اپنے ہاتھ سے آپ کے حوالہ کروں۔ اور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ کسریٰ نے درباریوں سے کہا کہ چھوڑ دو! اس کو میرے پاس آنے دو۔ حضرت عبداللہؓ نے کسریٰ کے قریب جا کر خط اس کے سپرد کر دیا۔ اور اس نے اپنے عرب سکریٹری کو بلایا (جو حیرہ کا باشندہ تھا) اور اسے اپنے سامنے خط کھولنے اور اس کو پڑھنے کا حکم دیا۔ اس نے خط کھول کر پڑھنا شروع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم من محمد رسول اللہ الی کسریٰ عظیم فارس۔ سلام علی من اتبع الھدیٰ ۔۔۔۔۔۔

خدائے رحمان و رحیم کے نام سے۔ محمد رسول اللہ کی طرف سے شاہ ایران کسریٰ کو۔ سلامتی ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔۔۔

خط کا اتنا حصہ سنتے ہی اس کے سینے میں غیظ و غضب کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور گردن کی رگیں تن گئیں۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خط کا آغاز اپنے نام سے کیا تھا۔ اس نے سکریٹری کے ہاتھ سے خط چھین لیا۔ اور اس کے مندرجات کو جانے بغیر اسے پرزہ پرزہ کرتے ہوئے چیخ اٹھا "میرا غلام، اور مجھے اس طرح خط لکھ رہا ہے؟" پھر اس نے حضرت عبداللہ بن حذافہؓ کو دربار سے نکال باہر کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ وہاں سے نکال دیئے گئے۔ حضرت عبداللہ دربار سے نکلے تو انھیں کچھ پتہ نہیں تھا کہ اب اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہے۔ آیا وہ قتل کر دئے جائیں گے یا انھیں آزاد چھوڑ دیا جائے گا؟ لیکن پھر انھوں نے اپنے دل میں کہا۔

"خدا کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خط پہنچانے کے بعد اب میرا جو بھی حشر ہو مجھے اس کی قطعی کوئی پرواہ نہیں ہے۔"

ادھر جب کسریٰ کا غصہ فرو ہوا تو اس نے حضرت عبداللہ کو دوبارہ اپنے سامنے پیش کئے جانے کا حکم دیا۔ لیکن وہ نہیں ملے۔ اس کے بعد آدمیوں نے انھیں بہتیرا تلاش کیا مگر ان کا کوئی سراغ نہ ملا۔ ان لوگوں نے جزیرۂ عرب تک جانے والے تمام راستوں میں انھیں چھان مارا مگر وہ ان کے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔

پھر حضرت عبداللہؓ خود دربار نبوی میں حاضر ہوئے تو انھوں نے کسریٰ کے ساتھ پیش آنے والے اتفاقات کی مکمل روداد آپ کے گوش گزار کر دی اور خط پھاڑنے کے واقعے سے بھی آپ کو آگاہ کیا ان کی یہ سرگزشت سن کر آپ نے صرف اتنا فرمایا "مَزَّقَ اللّٰہُ مُلْکَہٗ" اللہ تعالیٰ اس کی سلطنت کو پارہ پارہ کرے۔

ادھر کسریٰ نے اپنے یمن کے گورنر باذان کو لکھا کہ اس شخص کے پاس جس نے حجاز میں نبوت کا دعویٰ کیا ہے، اپنے دو قوی و طاقتور آدمیوں کو بھیجو، اور انھیں حکم دو کہ اسے پکڑ لائیں اور میرے سامنے

پیش کریں۔ حسبِ حکم باذان نے اپنے دو بہترین آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف روانہ کئے اور ان دونوں کے ہاتھ آپؐ کو ایک خط بھی بھیجا جس میں اس نے لکھا کہ آپ بلا تاخیر ان کے ساتھ کسریٰ کے سامنے پیش ہونے کے لئے چلے آئیں۔ اس نے ان دونوں سے یہ بھی کہا کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے مکمل آگاہی حاصل کریں اور ان کے متعلق مفصل معلومات فراہم کر کے اس کو آگاہ کریں۔

وہ دونوں پیہم اور تیز رفتاری کے ساتھ مراحلِ سفر طے کرتے ہوئے طائف پہنچے۔ وہاں ان کی ملاقات قریش کے ایک تجارتی قافلے سے ہوئی۔ ان سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ یثرب میں ہیں۔ اس کے بعد تاجر خوش و خرم اور شاداں و فرحاں مکہ پہنچے اور انھوں نے قریش کو خوشخبری دیتے ہوئے کہا کہ "یہ بات تمھارے لئے بڑی خوش کن اور مسرت انگیز ہے کہ کسریٰ، محمد کے درپے آزار ہو گیا ہے اور اس نے تمھیں اس کے شر سے بچا لیا ہے۔" ادھر ان دونوں نے مدینہ کا رُخ کیا۔ وہاں پہنچ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور باذان کا خط آپ کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ "شہنشاہ کسریٰ نے ہمارے حاکم باذان کو ہدایت کی ہے کہ وہ آپ کو لانے کے لئے کسی کو بھیجے۔ چنانچہ ہم اسی لئے آئے ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ چلے چلیں۔ اگر آپ ہماری بات مان لیں تو ہم کسریٰ سے بات کر کے آپ کے لئے رعایت حاصل کر لیں گے اور آپ کو اس کی طرف سے پہنچنے والی ہر متوقع تکلیف اور اذیت سے بچا لیں گے۔ لیکن اگر آپ نے ہماری بات ماننے سے انکار کیا تو آپ خود اس کی قوت و سطوت سے بخوبی واقف ہیں۔ آپ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ آپ کو اور آپ کی پوری قوم کو تباہ و برباد کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی یہ باتیں سن کر مسکراتے ہوئے فرمایا کہ "آج تو تم لوگ اپنی قیام گاہ پر واپس جاؤ، کل پھر آنا۔" جب دوسرے دن وہ دونوں بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور پوچھا کہ "کیا آپ نے ہمارے ساتھ چلنے اور کسریٰ سے ملنے کے لئے خود کو تیار کر لیا ہے؟" تو آپؐ نے جواب دیا کہ "آج کے بعد تم کسریٰ سے نہیں مل سکو گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے بیٹے "شیرویہ" کو فلاں مہینے کی فلاں رات اس کے اوپر مسلط کر کے اسے ہلاک کر دیا ہے۔"

یہ سن کر ان کے چہروں پر دہشت و حیرانی کے آثار ظاہر ہوئے اور وہ ٹکٹکی باندھ کر آپ کی طرف

دیکھنے لگے۔ پھر وہ اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے بولے۔

"جانتے نہیں آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا یہ بات ہم باذان کو لکھ دیں؟"

"ہاں" اور اس کو یہ بھی لکھ دینا کہ میرا دین کسریٰ کی سلطنت کے آخری حدود تک پہنچے گا اور اسے یہ بھی لکھ دو کہ اگر تم اسلام قبول کر لو تو میں تمھارا یہ سارا زیرِ حکومت علاقہ تمھارے سپرد کر کے تم کو تمھاری قوم کا حکمراں بنا دوں گا۔" آپؐ نے جواب دیا۔

اس کے بعد وہ دونوں آپؐ سے رخصت ہو کر باذان کے پاس پہنچے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی خبر سے اس کو مطلع کیا۔ باذان نے کہا کہ اگر محمدؐ کی یہ بات درست ہے تو یقیناً وہ اللہ کے نبی ہیں۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو سوچوں گا کہ مجھے ان کے ساتھ کیا رویہ اپنانا چاہئے۔ پھر اس کے چند ہی روز بعد "شیرویہ" کا خط باذان کے پاس پہنچا۔ جس میں اس نے لکھا تھا۔

"میں نے کسریٰ کو قتل کر دیا ہے۔ میں نے اس کو اپنی قوم کے انتقام میں قتل کیا ہے۔ اس نے ہماری قوم کے شرفاء کو قتل کرنا، ان کی عورتوں کو کنیز بنانا اور ان کے اموال کو غصب کرنا اپنا شیوہ بنا لیا تھا۔ جب میرا یہ خط تمھارے پاس پہنچے تو اپنے پاس موجود تمام لوگوں سے میری اطاعت و فرمانبرداری کا عہد لے لو۔"

باذان نے اس خط کو پڑھتے ہی ایک طرف پھینک کر اپنے دخولِ اسلام کا اعلان کر دیا اور اس کے ساتھ ہی یمن میں رہنے والے سارے ایرانیوں نے اسلام قبول کر لیا۔

یہ کہانی تو تھی حضرت عبداللہ بن حذافہؓ کی کسریٰ شاہِ ایران کے ساتھ ملاقات کی۔ رہی قیصرِ روم سے ان کی ملاقات کی کہانی تو وہ یہ ہے۔ قیصرِ روم کے ساتھ حضرت عبداللہؓ کی ملاقات، خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن خطابؓ کے عہدِ خلافت میں ہوئی تھی۔ ان کی ملاقات کا یہ قصہ بھی حد درجہ دلچسپ اور نہایت حیرت انگیز ہے۔

امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ نے ۱۹ھ میں رومیوں سے جنگ کرنے کے لئے ایک فوج روانہ کی تھی جس میں حضرت عبداللہ بن حذافہؓ بھی شریک تھے۔ مسلمان مجاہدین کی صداقتِ ایمانی، عقیدہ کی پختگی اور راہِ خدا میں ان کی جانبازی و جاں سپاری کی خبریں قیصرِ روم تک پہلے سے پہنچی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنے فوجی افسروں کو اس بات کی ہدایت کر دی تھی کہ وہ اگر کسی مسلمان سپاہی کو

گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو اسے قتل نہ کریں بلکہ زندہ اس کے سامنے پیش کریں۔ خدا کی مرضی اتفاق سے حضرت عبداللہ بن حذافہؓ رومی فوجیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔ رومی انھیں بادشاہ کے پاس لائے اور یہ کہتے ہوئے اس کے سامنے پیش کیا کہ "یہ شخص محمدؐ کے ان اصحاب میں سے ہے جنھوں نے بالکل آغازِ دعوت کے زمانے میں ان کی پکار پر لبیک کہا تھا۔ ہم اس کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئے اور حسبِ حکم آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔"

قیصر انھیں دیر تک بغور دیکھتا رہا۔ پھر ان سے کہنے لگا۔

"میں تمھارے سامنے ایک بات پیش کر رہا ہوں۔"

"وہ کیا بات ہے؟" حضرت عبداللہؓ نے پوچھا۔

"تم نصرانیت قبول کر لو۔ اگر تم نے میری یہ بات مان لی تو میں تمھیں رہا کر دوں گا، اور تمھارے ساتھ عزت و تکریم کا بہترین سلوک کروں گا۔"

حضرت عبداللہؓ نے اس کی اس پیشکش کو پائے نفرت و حقارت سے ٹھکرا دیا اور حد درجہ عزم و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا

"یہ ناممکن ہے۔ موت مجھے تمھاری اس پیشکش سے ہزاروں گنا زیادہ محبوب ہے۔"

"میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ایک نہایت زیرک و دانا آدمی ہو۔ اگر تم میری یہ پیشکش قبول کر لو تو میں تمھیں اپنے اقتدار میں شریک کر لوں گا۔" کسریٰ ان کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

بادشاہ کی اس سحر انگیز پیشکش کو سن کر بوجھل زنجیروں میں جکڑا ہوا قیدی بے ساختہ مسکرا دیا، اور اس نے نہایت بے نیازی اور لاپروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

"خدا کی قسم! اگر تم عرب و عجم کی ساری سلطنت بھی مجھے دے دو اور اس کے بدلے صرف یہ چاہو کہ میں ایک لمحے کے لئے دینِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پھر جاؤں تو یہ بھی میرے لئے قطعاً ناقابلِ قبول ہے۔"

"تب میں تم کو قتل کر دوں گا۔" قیصر نے دھمکی دیتے ہوئے کہا

"تمھاری مرضی۔ جو چاہو کرو۔" حضرت عبداللہؓ نے اس کی دھمکی سے مرعوب ہوئے بغیر جواب دیا۔

پھر قیصر نے انھیں ٹکٹکی پر باندھنے کا حکم دیا۔ اس کے اس حکم کی فوراً تعمیل کی گئی اور انھیں

ٹکٹکی پر باندھ دیا گیا۔ اس کے بعد اس نے جلاد سے رومی زبان میں کہا کہ "ان کے دونوں ہاتھوں کے آس پاس تیر چلاؤ۔" وہ اس سارے وقت بھی انھیں نصرانیت قبول کرنے کی دعوت دے رہا تھا مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ پھر اس نے جلاد کو ان کے پاؤں کے ارد گرد تیر مارنے کا حکم دیا۔ اس دوران بھی وہ انھیں اپنا دین چھوڑنے کی دعوت دیتا رہا لیکن انھوں نے پھر بھی انکار کیا۔ تب قیصر نے جلاد کو رک جانے کا اشارہ کیا اور کہا کہ انھیں تختۂ دار سے نیچے اتار دو۔ پھر اس نے ایک بڑی سی دیگ منگوائی، اس میں تیل ڈلوایا اور اسے آگ پر رکھوا دیا۔ جب تیل کھولنے لگا تو اس نے مسلمان قیدیوں میں سے دو آدمیوں کو بلوایا اور ان میں سے ایک کو کھولتے ہوئے تیل میں ڈلوا دیا۔ اس میں پڑتے ہی اس کے بدن کا گوشت الگ ہو گیا اور ہڈیاں نظر آنے لگیں۔ قیصر نے حضرت عبداللہ بن حذافہ کی طرف رخ کرتے ہوئے پھر ان کو نصرانیت قبول کرنے کی دعوت دی۔ مگر انھوں نے پہلے سے بھی زیادہ سختی کے ساتھ اس کی دعوت کو رد کر دیا۔

جب وہ ان سے بالکل مایوس ہو گیا تو انھیں بھی اسی دیگ میں ڈالنے کا حکم دیا جس میں ان کے دونوں ساتھیوں کو ڈالا گیا تھا۔ جب انھیں کشاں کشاں دیگ کی طرف لے جایا جا رہا تھا، ان کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ سپاہیوں نے قیصر سے کہا کہ "وہ رو رہا ہے"۔ قیصر نے سمجھا کہ اب گھبرا کر جواب دے گیا ہے۔ اس نے سپاہیوں سے کہا کہ اسے میرے پاس لاؤ۔ جب حضرت عبداللہؓ اس کے پاس پہنچے تو اس نے پھر اپنی اسی خواہش کا اعادہ کیا کہ وہ نصرانیت اختیار کر لیں۔ مگر حضرت نے انکار کیا تو اس نے دریافت کیا کہ "پھر تم رو کیوں رہے تھے؟"

"میرے دل میں یہ خیال آیا کہ عبداللہ! اس وقت تم اس دیگ میں ڈال دیے جاؤ گے اور تمھاری جان نکل جائے گی۔ حالانکہ میری خواہش تھی کہ کاش میرے بدن میں اتنی ہی جانیں ہوتیں جتنے بال ہیں اور وہ تمام جانیں ایک ایک کر کے خدا کے دین کے لئے اس دیگ میں ڈالی جاتیں۔ اسی خیال پر مجھے رونا آ گیا۔" حضرت عبداللہؓ نے جواب دیا۔

"اچھا کیا تم میرے سر کو بوسہ دے سکتے ہو؟" جابر ظالم نے پوچھا۔ "اگر تم ایسا کرو تو میں تم کو رہا کر دوں گا۔"

"اور میرے دوسرے تمام مسلمان ساتھیوں کو بھی؟" حضرت عبداللہؓ نے سوال کیا۔

"ہاں! دوسرے تمام مسلمان قیدیوں کو بھی تمھارے ساتھ رہا کر دیا جائے گا۔" قیصر نے جواب دیا۔

(بقیہ صفحہ ۵۲)

صاحب علی خان، ریسرچ اسکالر
۴۳ سی، آر ایم ایل، اے، ایم یو
علی گڑھ

رشید احمد صدیقی
مضامین رشید کے آئینے میں

رشید احمد صدیقی اردو نثر کا ایک ایسا نام ہے جس سے ہمیں بے کراں پیار ہے۔ ان کی مضمون نگاری نثری گلستان میں ایک نایاب گل کی مانند ہے جس کی نکہتیں ادب نوازوں کو ہمیشہ مسحور کرتی رہے گی۔ انھوں نے اپنی تحریروں اور زندگانی اور کوائف سماجی کی وہ سرگوشیاں پیدا کیں کہ اپنے طرز کے وہ موجد بھی ٹھہرے اور خاتم بھی۔ رشید احمد صدیقی نے اپنی ادبی زندگی کے تقریباً پچاس سال کے سرمایے میں متنوع اور متعدد تصانیف اور مقالات کے ذریعہ گراں قدر اضافے کئے۔

رشید احمد صدیقی اردو کے ایک صاحب طرز ادیب، انشاپرداز، مرقع نگار اور مکتوب نویس تھے۔ جنھوں نے اردو نثر کو جدید افادیت کے الفاظ میں اس قابل بنادیا کہ وہ دنیا کی نثر سے آنکھیں ملا سکے۔ سچ پوچھئے تو ان کی مزاح نگاری اور مرقع نگاری کا ہمہ گیر اور ہمہ جہت اعتراف ہوا ہے۔ رشید احمد کے مضامین میں سنجیدگی کے ساتھ ظرافت پائی جاتی ہے اور ان کی تحریروں میں علمی، سیاسی، اخلاقی اور سماجی موضوعات ملتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی کے مضامین کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں — "مضامین رشید"، "خنداں"، "آشفتہ بیانی میری"، "ہم نفسان رفتہ" اور "گنج ہائے گراں مایہ" ان کی مشہور تصانیف ہیں۔

"مضامین رشید" رشید صاحب کے ابتدائی مضامین کا اشاعت ثانی ہے۔ انجمن ترقی اردو نے ۱۹۶۳ء میں شائع کیا تھا "مضامین رشید" جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے ان کے ابتدائی مضامین کا مجموعہ ہے۔ لیکن جہاں تک مضمون نویسی کی تعریف کا تعلق ہے یہ ایک قسم کی عام نثر ہے جس کا اطلاق ہر نثری صنف ادب پر ہو سکتا ہے۔ مذہبی، اخلاقی، تاریخی، مقالے، انشائیے اور خاکے بھی اس صنف میں شامل کئے جا سکتے ہیں۔ گویا مضمون ایک عام لفظ ہے جو کہ ایک زمانے میں اس کی تقسیم اس طرح کی گئی تھی کہ مختلف قسم کے مضامین کو مختلف نام سے منسوب کیا جا سکے۔ اس لئے سے مضامین

کہا گیا۔ اس کتاب میں کل اکیس ۲۱ مضامین ہیں جن کی ترتیب اس طرح ہے: (۱) کچھ اپنے کچھ اپنے مضامین کے بارے میں (۲) سرگزشت عہد گل (۳) حاجی صاحب (۴) مولانا سہیل (۵) دھوبی (۶) وکیل صاحب (۷) اپنی یاد میں (۸) چارپائی (۹) پاسبان (۱۰) ارہر کا کھیت (۱۱) گواہ (۱۲) شیطان کی آنت (۱۳) ماتا بدل (۱۴) کارواں پیداست (۱۵) گھاگھ (۱۶) آدمی آدرو (۱۷) مغالطہ (۱۸) مرشد (۱۹) مثلث (۲۰) کچھ کا کچھ (۲۱) سلام ہو تجھ پر

"مضامین رشید" کا فنی تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بیشتر مضامین انشائیے ہیں یا خاکے۔ مثلاً حاجی صاحب، مولانا سہیل، دھوبی، وکیل صاحب، ماتا بدل اور مرشد مضامین خاکوں کے ذیل میں آتے ہیں۔ اب جہاں تک خاکوں کا تعلق ہے یہ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ پہلا قسم کسی مشہور و معروف اور مخصوص شخصیت کے بارے میں ہوتا ہے۔ جیسے مرشد، مولانا سہیل اور ماتا بدل۔ دوسرے قسم کے خاکے کسی خاص شخصیت کے نہیں ہوتے ہیں بلکہ پہلے ہی سے طے شدہ ہوتے ہیں جنھیں ہم ٹائپ کہہ سکتے ہیں مثلاً دھوبی، وکیل صاحب اور گواہ۔

"مضامین رشید" میں کئی مضامین قطعی طور پر انشائیے ہیں۔ چارپائی، پاسبان، ارہر کا کھیت، آدمی آدرو اور کچھ کا کچھ وغیرہ مضامین اسی زمرے میں آتے ہیں۔ اس مجموعے میں رشید احمد صدیقی کے بہترین مزاحیہ مضامین چارپائی، ارہر کا کھیت، گواہ، مغالطہ، دھوبی اور پاسبان ہیں۔ مثلاً اپنی یاد میں، سرگزشت عہد گل، وکیل صاحب، اور گواہ، ان کی اپنی سرگزشت دوستوں کے تحریر کردہ خاکوں میں بھی ملتی ہے۔ مولانا سہیل، ماتا بدل اور حاجی صاحب ان کی شخصیت نگاری کے نقوش ہیں۔ ان میں وہی بے ساختگی اور خلوص ہے۔ جو تمام مخلص دوستوں کے ساتھ رہا ہے۔ ان کے مضامین میں ایک مضمون بڑا اہم ہے۔ اس کا عنوان ہے "اپنی یاد میں" اس میں رشید احمد صدیقی نے خاص تکنیک سے کام لیا ہے اور اپنے بارے میں اس طرح بیانات دیئے ہیں گویا مرنے کے بعد بیانات دیئے جا رہے ہیں۔ یہ ایک دلچسپ پہلو ہے۔ ابتدا ہی میں لکھتے ہیں —

"سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مرجانے کے بعد بیان دے تو آپ اسے سچ مانیں گے یا جھوٹ؟ اس سوال کا جواب دینے میں آپ کو مشکلات کا سامنا ہو یا نہ ہو مگر کراماً کاتبین کو یقیناً ہو گا!"

رشید صاحب نے ظرافت کے سلسلے میں بالا سطور میں جو خیال ظاہر کیا ہے اس سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ وہ ظرافت میں خوش سلیقگی کے قائل تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی تحریروں میں قہقہہ لگانے والی بات نہیں بلکہ تبسم زیر لب کی بات ہے۔ اس مضمون کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ اس میں رشید صاحب نے اپنے فن کے بارے میں بعض باتوں کی وضاحت خود کر دی ہے۔ مثلاً اکثر ناقدین نے رشید احمد صدیقی کے مضامین پر اعتراض کیا ہے کہ ان کی تحریروں میں علی گڑھ کی اتنی باتیں ہیں کہ باہر کے لوگ ان کے سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ رشید صاحب کو خود اعتراف ہے کہ علی گڑھ ان کی شخصیت کا جز ہے ـــ

"زندگی کا سب سے وسیع حصہ علی گڑھ میں اور علی گڑھ کے لئے صرف ہوا۔"

حقیقت یہ ہے کہ رشید صاحب نے جو کچھ سیکھا اس میں علی گڑھ کا بہت دخل ہے علی گڑھ کی اقامت گاہیں، اس زمانے کے ذہین، بذلہ سنج، نکتہ داں اور زندہ دل طلبا سے آراستہ تھیں۔ ان کے کمروں میں بڑی لطیف گفتگو اور پر لطف مذاق ہوتا تھا۔ رشید صاحب کے اسلوب تحریر میں ان صحبتوں کا بڑا دخل ہے جس کا ذکر خود ان کی زبانی سنئے:

"اندازِ گل افشانیٔ گفتار مجھ میں علی گڑھ ہی میں پیمانۂ صہبا سے آیا، کسی معقول آدمی سے سابقہ ہو، بے اختیار سوال کرتا: علی گڑھ میں بھی پڑھا ہے؟ وہ کہتا نہیں تو افسوس ہوتا کیسی کمی رہ گئی"

وہ اعتراض کہ علی گڑھ سے غیر متعلق اشخاص رشید احمد صدیقی کے مضامین سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ بعض لوگوں نے انہیں طنزاً مشورہ بھی دیا کہ رشید صاحب آپ اپنے ہر مضمون کے ساتھ ایک فرہنگ کا بھی اضافہ کر دیا کیجئے۔ تو جواب میں لکھتے ہیں:

"اعتراض صحیح ہے مشورہ غلط، فرہنگ اضافہ کرنے کا کام میرا نہیں، ان کا ہے جو میرے مضامین کو سمجھنا چاہتے ہیں۔"

اپنے اہم مضمون "اپنی یاد" میں رشید احمد صدیقی نے طنز و ظرافت کے فرق کو بھی واضح کر دیا ہے فرماتے ہیں۔

"ظرافت میں طنز مضمر ہوتی ہے۔ طنز میں ظرافت کو دخل نہ کرنا چاہئے ظرافت کے لئے خوش دلی، آزادی اور فرصت درکار ہوتی ہے۔ طنز میں جوش، رنج،

غصہ، اور بے زاری کی کارفرمائی ہوتی ہے۔"

اس مضمون سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رشید صاحب کے مضامین کس نوعیت کے ہیں۔ انھوں نے اگرچہ انشائیے کی اصطلاح استعمال نہیں کی۔ لیکن اپنے مضامین کے تخلیقی عمل کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تحریریں انشائیے کی ساری شرائط کو پورا کرتی ہیں۔

"میں لکھنے میں ابتدا، ارتقا اور عروج وغیرہ قسم کے مراحل و مراتب ملحوظ نہیں رکھتا۔"

انشائیے کی اب تک جتنی تعریفیں کی گئی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ انشائیہ ایک مختصر اور بے تکلف اسلوب ہوتا ہے۔ انشائیہ ایک ایسی تحریر ہے جس میں گفتگو کی طرح انسان ایک جگہ نہیں رکتا۔ جس طرح اس میں (انشائیے) میں مختلف حالات، کیفیات، مناظر، تجربے اور مشاہدے بیان ہوتے چلے جاتے ہیں اسی طرح اس میں کوئی ربط، ترتیب اور تنظیم بھی نہیں ہوتی ہے اور انشائیہ نگار درمیان میں قصے، حکایتیں اور لطیفے بھی سناتا جاتا ہے جس کی وجہ سے انشائیے میں کوئی معنوی اور منطقی تسلسل دکھائی نہیں دیتا۔ رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں

"میرے مضامین غزل کی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ مربوط اور مسلسل نظم کی مانند نہیں۔ ان مضامین میں جو باتیں غیر متعلق اور بے تکی معلوم ہوتی ہیں وہ میرے فن کی شریعت کے مطابق محض عقل کی باتیں نہ دیر تک کی جا سکتی ہیں اور نہ دیر تک سنائی جا سکتی ہیں۔"

رشید احمد صدیقی کے اسلوب کا تانا بانا انشائیہ نگاری کے اس طرز نگارش نے تیار کیا ہے جسے سجاد حیدر یلدرم، عبدالرحمن بجنوری، مہدی افادی اور سجاد انصاری نے تخلیق اور تشکیل کی تھی۔

رشید احمد صدیقی کے طرز تحریر کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان کی عبارتیں معنی اور مفہوم کے اعتبار سے مختلف سمتوں میں حرکت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ان کی تحریروں سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ رشید صاحب اپنے فیصلوں میں کتنے بے باک اور اپنی بات کے اظہار میں بے تکلف ہیں۔ رشید احمد صدیقی لفظوں کے اچھے شناسا اور رمز شناس ہیں۔ ان کا اسلوب تحریر اپنی انفرادیت، شگفتگی، برجستگی، شائستگی، بذلہ سنجی اور نکتہ آفرینی کی وجہ سے دلوں کو موہ

لیتا ہے۔ بے شک رشید صاحب کے اسلوب میں متعدد اور متنوع خصوصیات پائی جاتی ہے۔

رشید صاحب اپنے مضامین میں (Paradox) کا استعمال کرتے ہیں یعنی ایسی دو چیزوں کا یکجا ذکر کرنا جس میں بظاہر کوئی مماثلت نہ ہو لیکن غور کرنے پر مماثلت کے پہلو نظر آجاتے ہیں مثلاً۔

"چارپائی اور مذہب ہم ہندوستانیوں کا اوڑھنا بچھونا ہے۔" یا

"مارواڑی عورتوں، بنگالی مردوں اور شرعی مسلمانوں کے ساتھ سفر کرنے میں بڑی کوفت ہوتی ہے"

رشید احمد صدیقی کے مضامین میں سر حرفی صنعت (Alliteration) بھی نظر آتی ہے یعنی ایسے الفاظ کو جمع کرنا جو کسی ایک ہی حرف سے شروع ہوتے ہیں۔ رشید صاحب کو یہ صنعت بہت مرغوب تھی۔ چنانچہ اس کا استعمال وہ خوب کرتے ہیں۔

"میرے نزدیک مارواڑی عورتیں مجموعہ ہیں تین چیزوں کا۔ گھونگھٹ، گھگری اور گہنا۔"

رشید صاحب کے مضامین اور موضوعات کا تعلق عموماً ایک محدود علاقے اور ماحول سے وابستہ ہے اس لیے ان کی تحریروں میں ایک خاص قسم کی اشاریت اور علامیت پیدا ہوگئی ہے یعنی ان میں کچھ ایسے خاص اشارے ملتے ہیں جنھیں اس سے ناوابستہ لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ مگر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی اقامتی زندگی سے جو لوگ واقف ہیں ان کو معلوم ہے کہ وہاں قدرتی طور پر کچھ اصطلاحات وضع ہوگئی ہیں۔ جن کو علی گڑھ والے جانتے اور بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ چونکہ رشید صاحب علیگ تھے اس لیے ان کے مضامین میں وہ مخصوص اصطلاحیں بکثرت ملتی ہیں جو صرف علی گڑھ کی دنیا میں بولی اور سمجھی جاتی ہیں مثلاً بلور، بدبدیت اور چارپائیت وغیرہ۔

"ہندوستانی ترقی کرتے کرتے تعلیم یافتہ جانور ہی کیوں نہ ہوجائیں اس سے اسکی چارپائی جدا نہیں ہوسکتی۔"

اکبر الٰہ آبادی نے اپنی شاعری کے ذریعے قوم کی سماجی، معاشرتی، مذہبی اور سیاسی حالات میں تبدیل ہونے والے واقعات کی اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے۔ رشید صاحب نے وہی کام اپنی نثر سے لیا۔ "مضامین رشید" میں مصنف کے طرز و مزاج کی تخلیقی اور فطری صلاحیتوں کا اظہار ہوا ہے انھوں نے اپنے دور کی سیاسی و سماجی ناہمواریوں پر زبردست طنز کیا ہے مثلاً برطانوی دور میں آئی۔ سی۔ ایس پر بھروسہ کیا جاتا تھا۔ شاعروں کا سارا کاروبار قافیہ سے چلتا تھا۔ طالب علم سمجھتے ہیں

کہ غل غپاڑہ اور ہنگامہ ہی زندگی کا مقصد ہے چنانچہ رشید احمد صدیقی اپنے مضمون چارپائی میں لکھتے ہیں:۔

"ہم کو چارپائی پر اتنا ہی اعتماد ہے جتنا برطانیہ کو آئی سی ایس پر، شاعر کو قافیہ پر اور طالب علم کو غل غپاڑے پر۔"

رشید احمد صدیقی کی تحریروں میں ان کا سیاسی و سماجی شعور بھی ظاہر ہوتا ہے انھوں نے برطانوی سامراج اور پارلیمان پر کہیں کہیں طنز کیا ہے۔ یہاں وہ اشارہ ان افراد کی طرف کرتے ہیں جو مفاد پسند، خود غرض اور موقع پرست لیڈر ہیں چنانچہ ان پر اس طرح طنز کی بوچھار کرتے ہیں۔

"اصل لیڈر نہ مار کھاتا ہے اور نہ مرنا گوارا کرتا ہے۔ لیڈر مار کھانا شروع کردے تو پھر قوم کی رہبری کون کرے! مار کھانا اور رہبری کرنا دونوں کام ایک لیڈر سے کیونکر انجام پاسکتے ہیں ـــــ تاہم یہ دستور چلا آتا ہے کہ مار کھانا قوم کا حق ہے اور مار سے بچنا لیڈر کا فرض۔"

رشید صاحب مزاحیہ انداز میں سماج کے بعض ناہموار پہلوؤں پر اس طرح طنز کر جاتے ہیں کہ ہمارے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگتا ہے اور ان کے چند جملوں سے وہ اثر مرتب ہوجاتا ہے جو پورے مضمون سے نہیں ہوتا ہے۔ ہندوستانی کاشتکاری کی پسماندگی، بدحالی اور مظلومی پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن مندرجہ ذیل اقتباس میں رشید صاحب نے ان کی حالتِ زار کو اس طرح بیان کیا ہے کہ چند سطریں افسانہ بن گئی ہیں۔

"بانو کی ٹوٹی چارپائی جسے مکئے کے کھیت میں بطور مچان باندھ دیا گیا ہے۔ ہر طرف جھومتے لہلہاتے کھیت ہیں۔ بارش نے گرد و پیش کو شگفتہ و شاداب کر دیا ہے۔ دور دور جھیلیں جھلکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ چمن میں طرح طرح کی آبی جانور اپنی بولیوں سے برسات کے عملداری اور مزیداری کا اعلان کرتے ہیں۔ مچان پر بیٹھا ہوا کسان کھیت کی رکھوالی کر رہا ہے اس کے یہاں نہ سائنس ہے، نہ آرٹ، نہ عشق و عاشقی، نہ علم و فضل، نہ دولت و اقتدار لیکن یہ سب چارپائی پر بیٹھے ہوئے اسی کسان کا کرشمہ ہے۔ پھر ایک دن آئے گا جب اس کی پیداوار کو چودھری، مہاجن یا زمیندار لوٹ لیں گے اور اسی چارپائی پر اس کو سانپ ڈس لے گا اور قصہ پاک ہوجائے گا۔"

رشید صاحب کے مضامین میں جا بجا تضاد بھی نظر آتا ہے۔ یعنی انھوں نے ایک ہی جملے میں دو متضاد باتیں کہہ دی ہیں مثلاً ــــ

"پھر وہ چارپائی پر لیٹ جائے گا، کراہے گا، گالی دے گا یا مناجات بدرگاہ قاضی الحاجات پڑھنا شروع کر دے گا۔"

چوں کہ رشید صاحب کا انداز تحریر مزاحیہ ہے اس لئے وہ اپنے مضامین میں جگہ جگہ دلچسپ لطیفے، حکایتیں اور واقعات بیان کرتے جاتے ہیں مثلاً چارپائی میں ریاست کا قصہ۔ جہاں ایک صاحب کے صاحبزادے ولایت سے ایک غلط سند لے کر واپس آئے تو انھیں ہوم ممبر بنا دیا گیا۔

"مضامین رشید" میں اشیاء، واقعات اور مختلف صورتحال کا بہ طریق احسن بیان ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں اشیاء کا انبار لگا دیتے ہیں اور مختلف واقعات اور حالات کا بھی ذکر کرتے جاتے ہیں مثلاً "چارپائی" میں چارپائی کے کثیر المقاصد ہونے کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

"اگر چارپائی آپ کے پاس ہے تو دنیا میں آپ کو کسی اور چیز کی حاجت نہیں، دوا کی پڑیا تکیے کے نیچے، جوشاندہ کی ڈیگچی سرہانے رکھی ہوئی ہے۔ بڑی بیوی طبیب، چھوٹی بیوی خدمت گزار۔ چارپائی سے ملا ہوا بول و براز کا برتن، چارپائی کے نیچے میلے کپڑے، بچوں کے کھلونے، جھاڑو، آش جو، روئی کے پھائے، کاغذ کے ٹکڑے، بچے، ٹھیکرا، محلے کے دو ایک بچے جس میں ایک آدھ زکام خسرے میں مبتلا۔"

"مضامین رشید" میں بے شمار جملے ایسے ملتے ہیں جو مصنف کی بالغ نظری کا ثبوت ہیں۔ اور جنہیں پڑھ کر ہم بیک وقت ہنسنے اور سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور اس امر کے اعتراف پر بھی کہ رشید صاحب نے مزاحیہ انداز میں مختلف حالات زندگی پر چبھتی ہوئی تنقید کر دی ہے۔ ان تنقیدی اشاروں کی صداقت اور ان کی اثر آفرینی ہی ان کی کامیابی کی دلیل ہے۔

"عشاق اور انگریز دو قومیں ایسی ہیں جو تعزیرات ہند سے بری ہیں اور سنہ میونسپلٹی سے ...."

"مضامین رشید" میں اس طرح کے بہت سے اقتباسات ہیں جو اردو نثر کے شائستہ اور شستہ مزاح اور متوازن ظرافت کے اچھے نمونے ہیں۔ اسلوب کی تازگی اور

برجستگی اور جملوں کی ساحرانہ رمزیت کے علاوہ مصنف کی ادبی ذکاوت اور مزاح نگاری کو چابکدستی کے ساتھ برتنے کی صلاحیت اور سلیقے نے "مضامین رشید" کو وقیع بنا دیا ہے۔

"مضامین رشید" میں جا بجا طنز و ظرافت کی بڑی لطیف اور مہذب تحریریں ملتی ہیں۔ درحقیقت رشید احمد صدیقی کے فن کا ایک کامیاب نمونہ "مضامین رشید" ہے۔ اس کا شمار ادب ہی میں نہیں بلکہ ادب لطیف میں بھی ہوتا ہے۔ رشید صاحب کے خیال کے مطابق ــــ

علی گڑھ ان کا اسلوب، فن، شخصیت کا اظہار و ابلاغ کا وسیلہ اور ذات کی شناخت ہے۔ وہ اپنے مخصوص طرز نگارش کی وجہ سے عہد جدید کے انشاپردازوں میں ممتاز اور منفرد ہیں۔ انھوں نے غزل کو اردو شاعری کی آبرو کہا ہے۔ اور رشید صاحب خود بیسویں صدی کی اردو نثر کی اور علی گڑھ کی آبرو تھے۔

بقیہ قائد

لیکن جو چیز متبعین کو اس سے ٹوٹنے نہیں دیتی وہ انکے دلوں میں قائد کی بے پناہ محبت اور اس سے والہانہ وابستگی ہے جو ایسے حالات میں تحریک کے حیات کی ضمانت ثابت ہوتی ہے۔

قائد و مقصود کا تعامل

کسی تحریک اسلامی میں قائد و مقصود کا تعامل نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ جہاں مقصود لازمی ہے کہ وہ قائد کی اطاعت اور اس کی محبت کو جزو جان بنائے وہیں قائد کا خاصہ ہے کہ وہ مقصود سے بے پناہ محبت اور ان کا درد رکھتا ہے۔ اس کا قلب ان کی فلاح کے جذبے سے معمور ہے اور ان کے لئے سخت کوشاں ہوتا ہے۔ قائد کا دل ان کی تکلیفوں پر تڑپ اٹھتا ہے۔ یہاں تک کہ اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہتا۔ جہاں مقصود اپنا سب کچھ قائد کے قدموں میں ڈال دیتا ہے وہیں قائد بھی اپنا سب کچھ ان پر نثار کر دیتا ہے۔ تحریک اسلامی کا قائد لوگوں کے صلہ اور توقیر کا طالب نہیں بلکہ اہل ہوتا ہے۔ وہ مقصود کے یہاں اس کا صلہ اور اس کی توقیر اس کی اطاعت و نصرت کے سوا کچھ نہیں۔

مولانا سید حامد علی

ایک طالب فن کے خط کا جواب

"ہندوستان کے رہنے والے ایک دوست نے جو آجکل سعودی عرب میں مقیم ہیں تحریک اسلامی کے ایک عرب رہنما کو خط لکھا تھا جس میں انھوں نے اپنی کچھ الجھنوں کو پیش کیا تھا اور کچھ سوالات کا جواب چاہا تھا۔ یہ صاحب جناب وحید الدین خاں صاحب کی تحریروں سے بہت متاثر اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے بدگمان تھے۔ ان کا خیال تھا کہ زبان و قلم سے دعوت ہی 'جہاد' ہے۔ انھوں نے اپنے خط میں "جہاد" اور "فتنہ" کے مفہوم کی وضاحت چاہی تھی۔ مندرجہ ذیل تحریر ان کے شبہات کے ازالے اور ان کے سوالات کے جواب کے لئے مرتب کی گئی تھی۔ تحریر سے سوالات و شبہات کی نوعیت واضح ہو جاتی ہے اس لئے خط کو درج نہیں کیا جا رہا ہے۔ واضح رہے کہ خط انگلش میں تھا اور اس کا جواب بھی انگلش میں دیا گیا تھا۔"

برادر عزیز! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط پاکر مسرت ہوئی کہ آپ اسلام کو جاننا اور اس کے لئے کام کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ نے مجھ سے مدد چاہی ہے۔ خط میں بہت زیادہ تفصیل میں جانا ممکن نہیں، البتہ میں کچھ بنیادی باتوں کی نشاندہی کروں گا۔

۱۔ قرآن مجید، احادیث، فقہ اور تفسیر وغیرہ کی کتابیں عربی میں ہیں۔ آپ جیسے ایک طالب علم کیلئے اسلام کو جاننے کا اصل طریقہ یہ ہے کہ عربی کو اچھا سیکھنے کی کوشش کریں تاکہ آپ قرآن، حدیث اور تفسیر و فقہ براہ راست خود سمجھ سکیں۔ اس کے لئے بول چال کی عربی نہیں، قرآن و حدیث کی عربی سیکھنے کی ضرورت ہے۔

۲۔ جب تک آپ عربی زبان کا کما حقہ علم حاصل نہ کر سکیں، قرآن مجید کو مستند ترجموں اور تفسیروں سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس سلسلے میں کسی ایک ترجمہ اور تفسیر پر اکتفا کرنا صحیح نہ ہوگا، کیونکہ اس سے

صرف ایک ذہن کی قرآن فہمی سامنے آئے گی۔ اردو زبان میں متعدد ترجمے اور تفسیریں ہیں۔ ان میں مولانا مودودیؒ کی "تفہیم القرآن" جو چھ جلدوں میں ہے، بہت مفید ہے۔ اس سے نہ صرف قرآن فہمی میں مدد ملے گی بلکہ اسلام کا صحیح فہم اور اسلام کا عصر حاضر میں انطباق بھی سامنے آئے گا۔ حدیث، سیرت اور فقہ کے علم میں بہت کچھ اضافہ ہوگا۔ سید قطب شہیدؒ کی تفسیر "فی ظلال القرآن" دور حاضر کی بہترین تفسیروں میں سے ہے۔ دور حاضر میں اسلام کا انطباق اور اس کے لئے جد وجہد کس طرح ہو اس کا واضح جواب آپ اس میں پائیں گے۔ یہ ایک علمی، دعوتی، تربیتی اور انقلابی تفسیر ہے۔ دنیائے اسلام میں بے حد مقبول ہے۔ یہ عربی میں ہے۔ مگر اس کے بیسویں پارے کا ترجمہ اردو اور انگلش میں ہو چکا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ سورہ فاتحہ اور سورہ بقرہ کی تفسیر کا اردو ترجمہ بھی شائع ہونے والا ہے۔ "تفہیم القرآن" اور "فی ظلال القرآن" کا آپ گہرائی میں جاکر مطالعہ کریں۔ مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر "تدبر قرآن" مل سکے تو وہ بھی فہم قرآن میں بہت مفید ثابت ہوگی۔

۳۔ اسلام کو سمجھنے کے لئے کسی ایک مصنف پر اکتفا نہ کریں بلکہ حاضر کے بھی معیاری اور مستند مصنفین کی کتابوں کا مطالعہ کریں۔ ہندوستان کے مصنفین کو آپ خود جانتے ہوں گے۔ عالم عرب کے مصنفین میں شیخ حسن البنا شہیدؒ، سید قطب شہیدؒ، عبدالقادر عودہ شہیدؒ، محمد قطب، محمد غزالی اور الاخوان المسلمین کے دوسرے مصنفین کی کتابوں کا مطالعہ کریں۔ ان حضرات نے اسلام کی دعوت اور اسلام کی سربلندی کی راہ میں طویل جد وجہد اور عملی تجربات کئے ہیں، جان و مال کی قربانی دی ہیں۔ ان کا لٹریچر عالم اسلام میں مقبول اور اسلام کو سمجھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اردو، انگلش اور دنیا کی متعدد زبانوں میں ان کے تراجم ہو چکے ہیں۔

۴۔ عصر حاضر کے اسلامی مصنفین میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سر فہرست ہیں۔ آج سے ساٹھ ستر سال قبل برصغیر ہند سمیت تمام عالم اسلام مغرب کی سیاسی غلامی کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا ساتھ ہی ذہنی غلامی کا بری طرح شکار تھا۔ مغرب جدید علوم اور جدید ترین طرز استدلال سے اسلام اور مسلمانوں پر حملہ آور ہو گیا تھا اور مسلمانوں کی جدید تعلیم یافتہ نسل خصوصیت سے مغربی افکار سے متاثر اور اسلامی عقائد و تعلیمات سے بیزار یا غیر مطمئن تھی۔ الحاد، تشکیک، کمیونزم اور مغربی افکار و نظریات کا تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ذہنوں پر تسلط تھا، مسلمانوں میں سے جو لوگ

ان حملوں کا جواب دینے کے بجائے ان کی تحریریں معذرت خواہانہ تھیں۔

انھی حالات میں آج سے ساٹھ ستر سال قبل جہاد کے موضوع پر ایک کتاب "الجہاد فی الاسلام" شائع ہوئی۔ اس وقت برصغیر ہند میں یہ مسئلہ پوری شدت سے ابھر کر سامنے آیا تھا۔ یہ اس موضوع پر ایک سنجیدہ علمی اور جامع کتاب تھی۔ اس میں قرآن و حدیث اور فقہ سے جہاد کے متعلق اسلامی تعلیمات کو بڑے ہی موثر استدلال کے ساتھ پیش کر دیا گیا تھا۔ ساتھ ہی مختلف مذاہب اور جنگ سے متعلق دنیا کے مختلف قوانین کو تقابلی مطالعہ کے لئے جمع کر دیا گیا تھا۔ یہ جہاد کے موضوع پر اب بھی حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے اور مولانا مودودیؒ کی ضخیم ترین کتابوں میں سے ہے۔ ڈاکٹر اقبال جیسا عظیم مفکر بھی اس کتاب سے متاثر ہوا اور اس کے بعد انھوں نے مولانا مودودیؒ کے مضامین ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھنا شروع کئے۔ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے ڈاکٹر اقبال ہی کے اصرار پر مولانا مودودیؒ حیدرآباد سے پنجاب منتقل ہوئے اور پھر تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے۔ تقریباً پچپن سال پہلے مولانا مودودیؒ نے آپ کے شہر حیدرآباد ہی سے ماہنامہ "ترجمان القرآن" جاری کیا۔ اس رسالہ میں ایک طرف مغربی افکار و نظریات پر کڑی تنقید ہوتی، دوسری طرف اسلامی تعلیمات کو اپنی صحیح صورت میں جدید طرز استدلال کے ساتھ پیش کیا جاتا۔ یہی مضامین بعد میں مختلف کتابوں کی شکل میں شائع ہوئے۔ اس طرح وہ مسلسل پچاس سال تک اسلام کے موضوع پر لکھتے ہوئے اپنے رب سے جا ملے۔ انھوں نے اپنے پیچھے اسلام سے متعلق ایک وسیع لٹریچر چھوڑا ہے۔ جو الہٰیات، عبادات، اخلاقیات، معاشرت، معیشت، سیاست، قانون، ریاست، انقلاب، اجتماعیت، تحریک، تنظیم، تربیت، جہاد، حدیث، سیرت، تقریباً تمام موضوعات پر محیط ہے۔ اتنا وسیع جامع اور علمی لٹریچر دور حاضر کے کسی بھی اسلامی مصنف کا نہیں ہے۔ دور حاضر کے شاید ہی کسی مصنف نے مشرقی اور مغربی علوم کا اتنا وسیع اور گہرا مطالعہ کیا ہو اور اسے اسلام کی تفہیم کے لئے اتنا استعمال کیا ہو۔ اس لٹریچر میں اسلام کا واضح، عمیق، مرتب، متوازن اور علم اور استدلال پر مبنی تصور ملتا ہے۔ یہ لٹریچر عالم اسلام میں اتنا ہی مقبول ہے۔ عالم عرب میں جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہی نہیں علماء بھی اس کی قدر و قیمت کے معترف ہیں۔ لاکھوں مسلمان نوجوان اسی کے ذریعے الحاد، تشکیک، فسق و فجور اور بے کرداری سے نجات پاکر اسلام کے متبع اور خادم بنے ہیں اور

ہزارہا غیر مسلموں کو اس سے ہدایت ملی ہے۔ جناب وحیدالدین خاں صاحب بھی اسی لٹریچر سے متاثر ہو کر اسلام کی خدمت کے لئے یکسو ہوئے اور ایک عرصے تک جماعت اسلامی ہند کے ذمہ داروں کے ساتھ مل کر کام کرتے رہے۔

مولانا مودودیؒ نے تصنیف و تالیف ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ انھوں نے ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی کی تشکیل کی اور اسلامی نظام کی سربلندی کے لئے انتھک جدوجہد میں لگ گئے۔ اس راہ میں انھوں نے متعدد بار جیل کی صعوبتیں سہیں۔ ایک بار حکومت پاکستان نے قادیانیت کے خلاف کتاب لکھنے پر انھیں پھانسی کی سزا دی جو اللہ کے فضل سے اور عالم اسلام کے شدید احتجاج کے نتیجے میں منسوخ ہو گئی۔ وہ ایک وسیع النظر عالم، عظیم مفکر، بلند پایہ داعی اور اسلامی تحریک کے اہم ترین رہنما تھے۔ ان کی اور ان جیسے تحریک اسلامی کے دوسرے معماروں کی کوششوں کو اللہ تعالیٰ نے شرف قبولیت بخشا اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اب جدید تعلیم یافتہ طبقہ اسلام کا معترف ہے۔ اسلامی نظام کو قابل عمل بلکہ واجب العمل سمجھنے لگا ہے۔ اسلام کو آخرت کی نجات کے ساتھ دنیا میں انسان کی کامرانی اور عدل و قسط کے قیام کے لئے ناگزیر تصور کیا جانے لگا ہے۔ اسلامی نظام اور اسلامی انقلاب کے لئے جگہ جگہ کوششیں ہو رہی ہیں اور پاکستان لادینی ریاست بننے کے بجائے اس کا رخ اسلامی نظام کے قیام کی طرف ہو گیا ہے اور اسلامی نظام خود غیر مسلموں میں غور و فکر کا موضوع بن گیا ہے۔ یہ لٹریچر اس لحاظ سے بہت قیمتی ہے کہ اس کا لکھنے والا کوئی نظری انسان نہیں ہے۔ وہ مسلسل میدان عمل میں رہا ہے۔ آپ جماعت اسلامی ہند و پاک کی بعض پالیسیوں، اور مولانا مودودیؒ کی بعض رایوں سے اختلاف کر سکتے ہیں مگر اس لٹریچر سے محرومی بدقسمتی کی بات ہوگی۔ اس سے اختلاف بھی اسے پڑھ کر ہی کرنا چاہئے۔

مولانا مودودیؒ اور جناب وحیدالدین خاں صاحب کے نقطۂ نظر میں کیا فرق ہے، اس کا صحیح اندازہ آپ کو دونوں کے لٹریچر کے مطالعہ ہی سے ہو سکے گا۔ خط میں اس تفصیل میں جانا ممکن ہے اور نہ مفید۔ نہ یہ صحیح ہے کہ ایک کی تحریر سے دوسرے کے بارے میں کوئی رائے قائم کی جائے۔

۵۔ کسی بھی اسلامی اصطلاح کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے یہ متعین کیا جائے کہ عربی میں اس کا مفہوم کیا ہے اور قرآن و حدیث میں اس کو کس مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے نیز یہ کہ

سلف نے اس کا کیا مفہوم سمجھا ہے۔ اس کے بعد یہ دیکھنا چاہیے کہ کسی خاص حالت میں اس کے انطباق کی کیا شکل ہوگی۔ اس سلسلے میں بھی ماضی سے بہت کچھ رہنمائی مل سکتی ہے کیونکہ امت مسلمہ مختلف زمانوں اور ممالک میں مختلف حالات سے گزر چکی ہے۔

"جہاد" مفہوم ہے "انتھک اور پوری جدوجہد" اور "جہاد فی سبیل اللہ" کے قرآن، حدیث اور علمائے سلف کی تصریحات کی روشنی میں معنی ہیں "حق کے غلبہ و سربلندی اور باطل کی مغلوبیت کے لئے انتھک اور پوری جدوجہد" بلاشبہ اس کا پہلا مرحلہ جہاد نفس ہے اور باطل کے خلاف زبان و قلم سے جدوجہد بھی جہاد میں داخل ہے لیکن اس لفظ کا غالب مفہوم ہے "دین کو مادی و سیاسی لحاظ سے غالب کرنے کی جدوجہد" یہ جدوجہد پُرامن بھی ہو سکتی ہے لیکن باطل کبھی بھی حق کی پرامن دعوت اور حق کے غلبے کی پرامن جدوجہد کو برداشت نہیں کرتا اس لئے وہ حق سے نبرد آزما ہو جاتا ہے، حق اور باطل کی کشمکش بڑھتی ہے اور پھر "قتال فی سبیل اللہ" کی نوبت آجاتی ہے، جس کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ حق کے غلبے کے لئے جنگ۔ اسلحہ کی جنگ کی جائے قرآن مجید اور احادیث رسول میں "جہاد فی سبیل اللہ" قتال فی سبیل اللہ کے معنی میں بہت زیادہ استعمال ہوا ہے ملاحظہ ہو سورہ بقرہ آیت ۲۱۸، آل عمران آیت ۱۴۲، مائدہ ۵۴، انفال آیت ۷۲، ۷۴، ۷۵، توبہ آیت ۱۹، ۲۰، ۴۴، ۸۱، ۸۸، حجرات آیت ۱۵، بالعموم ایسے مواقع پر "باموالہم وانفسہم" کے الفاظ بھی مستعمل ہوئے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ یہ دین کو غالب کرنے کی وہ جدوجہد ہے جس میں مالی قربانی کے ساتھ جانی قربانی بھی دینی پڑتی ہے سورہ توبہ آیت ۴۴، ۴۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کی جانی و مالی قربانی کے بغیر آدمی کا ایمان معتبر نہیں، سورہ توبہ آیت ۴۱ میں ہے: انفروا خفافا وثقالا وجاھدوا باموالکم وانفسکم فی سبیل اللہ۔ یہاں جہاد کا استعمال صراحۃً "قتال" کے مفہوم میں ہوا ہے۔ سورہ صف کی آیت ۳ میں ہے ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفا کانہم بنیان مرصوص" پھر آیت ۱۱ میں اسی قتال کو جہاد کہا گیا ہے تؤمنون باللہ ورسولہ وتجاھدون فی سبیل اللہ باموالکم وانفسکم آیت ۱۳ میں واخری تحبونھا نصر من اللہ وفتح قریب کے الفاظ شاہد ہیں کہ یہاں جہاد سے مراد قتال ہی ہے۔ سورہ توبہ آیت ۱۱۱ میں ہے کہ اللہ نے اہل ایمان سے ان کی جان اور مال کو خرید لیا

ہے تاکہ وہ جان و مال قربان کر کے اللہ کے دین کو غالب کرنے کی مسلح جدوجہد کریں۔ اس کے عوض میں اللہ انھیں جنت عطا فرمائے گا۔

بلاشبہ دعوت دین کی بہت اہمیت ہے مگر دین کی دعوت جہاد فی سبیل اللہ کی قائم مقام نہیں ہو سکتی انبیاء میں اور دعوت دین کے ساتھ دین کو غالب و سربلند کرنے کی کوشش ناگزیر ہے، اور کسی دور میں یہ ممکن نہیں کہ دین کی دعوت واضح اور صحیح طور پر دی جائے جیسا کہ انبیاء علیہم السلام نے دی، اور غالب نظام باطل اسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرے۔ پہلے بھی شدید کشمکش ہوئی ہے آج بھی موجود ہے، آئندہ بھی ہوگی۔ صرف زبان و قلم سے دین کی دعوت دینے کو جہاد سمجھنا قرآن، حدیث، سیرت سب سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

مختلف ممالک میں جہاد فی سبیل اللہ کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں لیکن ایک بات پوری طرح واضح رہنا چاہیے اور وہ یہ کہ امت مسلمہ کا مقصد زندگی ہے، دین کو غالب و سربلند کرنا اور اسلام جو پوری زندگی پر حاوی دین ہے اس پر پوری طرح عمل در آمد اسی وقت ممکن ہے۔ جب کہ وہ غالب و سربلند ہو، اور کوئی دوسرا دین یا نظام انسانی زندگی پر چھایا ہوا نہ ہو۔ نظام باطل کے زیر سایہ تو عقیدہ، عبادات اور پرسنل لا کو بچانا بھی سخت مشکل ہے۔ چہ جائیکہ پوری زندگی میں اسلام پر عمل کرنا۔

"وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ ویکون الدین للہ" میں فتنہ کا مفہوم کیا ہے، اس پر غور کرنے سے پہلے دو باتوں کو سمجھ لینا چاہیے ایک یہ کہ اس آیت میں اہل ایمان کو اہل باطل سے قتال، مسلح جنگ، کا حکم دیا گیا ہے، اور یہ حکم قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر ہے، سورہ بقرہ، آل عمران، نساء، مائدہ، انفال، توبہ، محمد وغیرہ بہت سی سورتوں میں یہ حکم صراحۃً موجود ہے۔

دوسری بات یہ کہ جنگ کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ دین یا اطاعت اللہ کے لئے ہو جائے، سورۂ انفال میں یہ آیت اس طرح ہے: "وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للہ (۳۹)" ان سے جنگ کرو تاکہ فتنہ نہ رہے اور اطاعت پوری کی پوری اللہ کے لئے ہو جائے۔ یہ دونوں آیتیں مدنی ہیں جبکہ اہل ایمان حالات کی گنجائش کے مطابق احکام دین کی مکمل اطاعت کر رہے تھے لیکن باطل کا زور ٹوٹا نہ تھا۔ بالفاظ دیگر اللہ کی مکمل اطاعت اسی وقت ممکن ہے جبکہ باطل کا اقتدار ختم ہو جائے اور زندگی اور زمین دین حق کے لئے خالی ہو جائے

و دواسی کے لئے اہل ایمان کو اہل باطل سے قتال کا حکم دیا گیا۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے "یعنی اللہ کا دین تمام ادیان پر غالب و سربلند ہو جائے جیسا کہ صحیح بخاری و صحیح مسلم میں ابو موسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: ایک شخص بہادری کے تحت جنگ کرتا ہے، ایک حمیت کے تحت، ایک دکھاوے کے لئے، ان میں سے کونسا "فی سبیل اللہ" ہے۔ فرمایا، جو شخص اس لئے جنگ کرے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو اس کی جنگ فی سبیل اللہ ہے"۔

اب "فتنہ" کو لیجئے! اس سے مراد ایسی حالت ہے جس میں اہل ایمان کو ان کے عقیدے یا دین سے ہٹائے جانے کا خطرہ ہو۔ یہی مفہوم سورہ بقرہ آیت ۱۹۱ میں فتنہ کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے۔ یہ خطرہ اسی وقت ختم ہو سکتا ہے جبکہ کفر و شرک اور اہل دو مغلوب ہوں، غالب نہ ہوں۔ غالب ہونے کی صورت میں، جیسا کہ قرآن نے جا بجا صراحت کی ہے۔ اس بات کا خطرہ رہے گا کہ اہل ایمان کو ان کے دین سے ہٹانے کی کوشش کی جائے۔

بقیہ حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمیؓ

حضرت عبداللہ بن حذافہ کہتے ہیں کہ میں نے دل میں سوچا کہ یہ اللہ کا ایک دشمن ہے، اگر میں اس کے سر کو بوسہ دے دوں تو یہ اس کے بدلے میں مجھے اور تمام مسلمان قیدیوں کو رہا کر دے گا۔ ایسا کر لینے میں میرا کیا نقصان ہے؟

پھر انھوں نے اس کے قریب جا کر اس کے سر کا بوسہ لے لیا۔ اور ہرقل نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ تمام مسلمان قیدی جمع کر کے عبداللہ بن حذافہ کے حوالے کر دیئے جائیں۔ اور اس کے اس حکم کی تعمیل کی گئی۔

حضرت عبداللہ بن حذافہ جب خلیفہ کی خدمت میں پہنچے تو انھوں نے اپنی یہ سرگزشت انکو سنائی۔ جس کو سنکر وہ بہت خوش ہوئے اور قیدیوں کو دیکھا تو فرمایا کہ "ہر مسلمان پر یہ حق ہے کہ وہ عبداللہ بن حذافہؓ کے سر کو بوسہ دے۔ اور یہ حق سب سے پہلے میں ادا کرونگا" ہوں اور پھر انھوں نے حضرت عبداللہ بن حذافہؓ کے سر کا بوسہ لیا۔

غزلیں

عزیز بگھروی

خنجر بدست ہے نہ جہاں سر بکف کوئی
آثار زندگی کے نہیں اس طرف کوئی
تم انتشارِ فکر و عمل کے ادھر شکار
میدانِ زندگی میں اُدھر صف بصف کوئی
اہل ہوس نے یاد کیا ہے اسے بہت
جب صاحب ضمیر ہوا ہے تلف کوئی
عزت ہر ایک سیپ کی قسمت میں ہے کہاں
ہوتا ہے سرفراز وہاں صدف کوئی
دل میں نہیں ہے جسکا کوئی پاس و احترام
لے کر اسی کا نام، اٹھائے حلف کوئی
ٹھکرا کے موتیوں کو جواہر کو چھوڑ کر
دامن میں بھر کے لے گیا خشت و خزف کوئی
یہ اپنے اپنے فکر و نظر کا ہے اختلاف
شائستہ سلف کوئی ننگِ سلف کوئی
ہم وارثانِ لوح و قلم کو بھی ہو عطا
یا رب اجہادِ حرف و قلم کا شرف کوئی
قائل ہے ترا طرزِ تخاطب بھی اے عزیز
روئے سخن کسی کی طرف ہے ہدف کوئی

عزیز الدین عزیز

آ تا جگہ برق مرا صحنِ چمن ہے
پھولوں کی قبا زرد تو کلیوں پہ کفن ہے
گو شاعری آزاد ہے، آزادیٔ فن ہے
پھر کیسی یہ آزاد فضاؤں میں گھٹن ہے
ہے دور لباسوں کا مگر عریاں بدن ہے
اور نعش بھی مل جائے تو محتاج کفن ہے
ویرانوں میں شہروں میں ہیں خوں ریز فضائیں
کیا قتل ہی اب مشغلہ اہل وطن ہے؟
تم جسم کی آزادی کو آزادی نہ کہنا!
جب ذہنی غلامی کی ضمیروں میں چبھن ہے
گھونگروں کی چھنن چھن ہے اذانوں کے بجائے
واعظ کے یہاں غلغلۂ درد و غم تنّن ہے
اب تک لب و رخسار کا خوگر ہے سخنور
کیا حسن ہی فنکار کا موضوع سخن ہے
جس باغ کے گل خار ہوں وہ باغ ہے دنیا
"دنیا جسے کہتے ہیں وہ دھوکے کا چمن ہے"
تجھ کو اے عزیز آیا میسر غم ملت
جلتا ہوا ہاتھوں میں ترے مشعل فن ہے

عبدالرشید نفیس فلاحی

علامہ سید سلیمان ندوی شخصیت و ادبی خدمات

مصنف:۔ ڈاکٹر محمد نسیم صدیقی ندوی

ناشر:۔ مکتبہ فردوس مکارم نگر۔ لکھنؤ

قیمت:۔ چالیس (۴۰) روپے۔

صفحات:۔ ۲۴۷ ، سائز ۲۰×۳۰

علامہ سلیمان ندوی کی صد سالہ برسی پر ملک اور بیرون ملک میں سیمیناروں ، علمی مجلسوں اور کانفرنسوں کے ذریعہ مرحوم کو جو خراج عقیدت پیش کیا جا رہا ہے اس میں یہ تصنیف ایک امتیازی مقام رکھتی ہے۔ دارالمصنفین کی تصنیف "حیات سلیمان" میں غالباً چند غلطیاں رہ گئی ہیں جس کی تصحیح ضروری تھی جس کی طرف علامہ مرحوم کے صاحبزادے ڈاکٹر سلمان ندوی نے اپنے خط میں (جو اس کتاب کے آغاز میں شامل ہے) اشارہ کیا ہے۔ ویسے بھی علامہ سلیمان ندوی کی زندگی کے بیشتر گوشے تحقیق طلب ہیں۔ یہ تصنیف ان ادبی گوشوں پر تفصیل سے بحث کرتی ہے۔ یہ کتاب دراصل وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر مصنف کو گورکھپور یونیورسٹی نے ۱۹۷۹ء میں پی ایچ۔ڈی کی ڈگری تفویض کی۔ اس کتاب میں آٹھ ابواب ہیں پہلا باب عہد اور ماحول پر، دوسرا سوانح اور کردار پر، تیسرا ادبی تصانیف پر، چوتھا باب مکاتیب پر، پانچواں باب شاعری پر، چھٹا باب تنقید پر، ساتواں باب صحافت پر اور آٹھواں باب اسلوب پر مشتمل ہے۔ مسرت اس امر پر ہے کہ مصنف نے تنقید و تبصرہ کی دشوار گزار گھاٹیوں سے گزرتے ہوئے خود اپنی تحریروں کی ادبیت اور چاشنی سے قارئین کو محروم نہیں رکھا ہے۔ یہ کتاب سید صاحب کی ادبی صلاحیت پر جتنا خوبصورت اور حسین تذکرہ ہے اتنا ہی مصنف کی انشاء پردازی کا بہترین نمونہ بھی ہے لیکن کتاب کے آغاز میں ڈاکٹر سلمان ندوی کے مکتوب کو شامل کرنا اور دارالمصنفین پر اس انداز میں تبصرہ کرنا شاید علمی و تحقیقی اسلوب کے لئے کچھ زیادہ مناسب نہیں ہے۔ کتاب کا حرف آغاز اس لحاظ سے خاصا اچھا ہے کہ اس میں اس عہد کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات بڑے سلیقہ سے ترتیب دیئے گئے ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ تصنیف اپنے موضوع پر بے مثل ہے۔ فاضل مصنف اور ناشر دونوں اس قابل قدر قیمتی تصنیف پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

★★

حلقۂ یاراں

ظفر الاسلام
تابش مہدی

برادر مکرم جناب ایڈیٹر صاحب حیات نو، جامعۃ الفلاح
بلریا گنج، اعظم گڑھ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

خدا کرے آپ بخیر ہوں ...... "حیات نو" کے فروری و مارچ ۱۹۹۶ء کے شمارے میں مولانا عبدالمجید ندوی صاحب کا مضمون "غیر عربی زبان میں ذکر و دعا اور خطبۂ جمعہ کی شرعی حیثیت" نظر سے گزرا۔ یہ مضمون بہت پسند آیا۔ متعدد فقہی ماخذ کی روشنی میں جس خوش اسلوبی سے اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے وہ یقیناً بہت اہم اور افادیت سے بھرپور ہے۔ قدیم فقہی ماخذ میں اس مسئلہ پر اظہار خیال سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ مذاہب اربعہ کے تشکیلی دور ہی سے یہ مسئلہ فقہاء کے یہاں موضوع بحث تھا۔ خود ہندوستان میں مرتب کی گئی فقہ کی کتابوں میں یہ بحث عہد سلطنت کے ابتدائی دور (۱۳ ویں صدی عیسوی) ہی سے ملتی ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ کم از کم جمعہ کے خطبہ میں غیر عربی زبان کے استعمال کے سلسلہ میں باقاعدہ کسی عملی اقدام کا ثبوت ٹیپو سلطان سے پہلے نہیں ملتا۔ ٹیپو سلطان نے پوری سنجیدگی سے اس کی اہمیت کو محسوس کیا اور خطبہ میں عربی کے بجائے فارسی زبان اختیار کرنے پر یہ عقلی دلیل فراہم کی کہ اُن حالات میں جبکہ اکثریت کی زبان فارسی ہے مذہبی تعلیمات اور شعائر اسلام کی ترویج و اشاعت کیلئے یہی زیادہ موزوں و مفید ہے۔ اس نے فارسی میں جمعہ و عیدین کے خطبات کا ایک مجموعہ مرتب کرایا جو "مؤید المجاہدین" کے نام سے مشہور ہوا اور اسے اپنے قلمرو سلطنت میں رواج دیا۔

غیر عربی زبان میں خطبۂ جمعہ و عیدین کی شرعی حیثیت اور افادیت سے قطع نظر عربی خطبات

کے مروجہ مجموعوں پر بھی نظرثانی کی ضرورت ہے۔ درحقیقت یہ ایک خاص دور اور مخصوص ماحول میں ترتیب دیے گئے تھے اور ان میں بعض باتیں اور کچھ کلمات ایسے ہیں جو موجودہ زمانہ میں بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔

والسلام
(ڈاکٹر) ظفر الاسلام

برادرم طارق صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

رانچی گیا۔ اور ضلع بستی کے سفر سے واپسی پر "حیات نو" کا تازہ شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ محترم مولانا جلیل احسن ندویؒ کے جو افادات آپ مرتب کرکے "حیات نو" میں شائع کر رہے ہیں، وہ خاصے کی چیز ہیں۔ اس سلسلے کو جاری رہنا چاہیے۔

خطبۂ جمعہ کے تعلق سے مولانا عبدالمجید ندویؒ کا مضمون نہایت اہم ہے۔ یہ اس قابل ہے کہ اسے کتابچے کی شکل میں شائع کرکے افادۂ عام کی غرض سے وسیع پیمانے پر تقسیم کیا جائے۔ کاش کسی اہل خیر کو خدا توفیق بخشے۔

"متاع آخر شب" کے تعلق سے میرا تاثراتی مضمون آپ نے شائع کیا، میں اس کے لیے تہہ دل سے ممنون و متشکر ہوں۔ لیکن ایک پیراگراف جو اصل مسودہ میں موجود ہے چھوٹ گیا ہے

"لیکن — راقم الحروف کے سامنے جب بھی کبھی حفیظ صاحب اور ان کی شاعری کی بات چلی، یہ سوال ضرور ابھر کر آیا کہ حفیظ صاحب عظیم ہیں کہ ان کی شاعری؟ اور آپ یقین کیجیے کہ اس کا جواب نہ اس وقت ممکن ہو سکا نہ آج۔ ان کے مزاج و طبیعت کی طرح صاف و شفاف، روشن و تابناک اور سادہ و بے آمیز ان کی شاعری اور ان کی غزلوں کی طرح دلچسپ و دل آویز اور حسین و پاکیزہ ان کی شخصیت نے گفتگو کو کبھی بھی کسی ایک نتیجہ پر نہیں پہونچنے دیا۔ بالآخر یہی کہنا پڑا کہ ان کی شاعری سے ان کی شخصیت کو اور ان کی شخصیت سے ان کی شاعری کو کبھی بھی جدا نہیں کیا جا سکتا۔ بالفاظ دیگر دونوں "من تو شدم تو من شدی" کی منزل میں ہیں۔ اگر کسی نے ان کی شاعری کو سمجھ لیا تو سمجھ لیجیے کہ حفیظ میرٹھی کا عرفان اسے حاصل ہو گیا۔ اور اگر کسی نے حفیظ میرٹھی کو سمجھ لیا تو گویا اسے ان کی شاعری کا بھی تعارف حاصل ہو گیا۔ میرے نزدیک یہی دلیل ہے ان کے وانّہم یقولون ما لا یفعلون کے زمرے سے استثنیٰ اور الا الذین آمنوا وعملوا الصالحات کی مبارک جماعت سے وابستگی کی۔"

ادارہ

جامعہ کے لیل و نہار

جامعہ میں امتحانات

خدا کے فضل و کرم سے جامعہ کا ایک اور تعلیمی سال اختتام کے قریب ہے۔ سالانہ امتحانات کی تیاریوں کا اعلان کر دیا گیا ہے اور یہ رسالہ جس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہوگا امتحانات شروع ہو چکے ہوں گے۔ امتحانات ۱۸ اپریل ۰۰ء سے شروع ہو رہے ہیں اور ۲۴ اپریل ۰۰ء کو اختتام پذیر ہو رہے ہیں۔ مولانا طیب اللہ صاحب فلاحی ناظم امتحان بنائے گئے ہیں۔ تمام طلبہ ہمہ تن امتحان کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں۔ اس وقت فلاح کا تعلیمی ماحول قابل رشک ہو گیا ہے۔

جامعہ میں توسیعی لکچر

۲۶/۲۷/۲۸ فروری ۰۰ء کو جامعہ میں ایک توسیعی لکچر کا پروگرام رکھا گیا۔ ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی لکچرار شعبہ اسلامیات علی گڑھ کو دعوت دی گئی اور موصوف نے قبول فرمایا۔ ۲۶ فروری کو تشریف لائے۔ ان کے ساتھ ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی، عبید اللہ فہد فلاحی اور فرید الدین بھی تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنا مقالہ "تاریخ اسلامی پر فکری یلغار" چار نشستوں میں سنایا۔ مقالہ بہت جامع اور تحقیقی تھا۔ طلبہ اور اساتذہ میں بہت پسند کیا گیا۔ اور کافی دلچسپی اور انہماک سے اس کی سماعت کی گئی۔ عربی کلاسز کے اکثر طلبہ پروگرام میں شریک رہے۔ پروگرام کے آخر میں سوال و جواب کا موقع دیا جاتا۔ طلبہ نے اس سے بھی خوب خوب استفادہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے یہاں کے ماحول اور طلبہ کی صلاحیتوں کو بہت سراہا اور تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا "طلبہ کے بعض سوالوں سے میرے علم میں اضافہ ہوا ہے۔ اس طرح کے سوالات تو پروفیسر حضرات بھی نہیں کرتے۔"

ڈاکٹر ظفر الاسلام صاحب نے بھی ایک مقالہ پیش کیا عنوان تھا "عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں فقہ اسلامی کا ارتقاء" مقالہ اچھا اور معلوماتی تھا۔ لوگوں نے بہت پسند کیا۔

مولانا وحید الدین خان کی آمد

۲۸ فروری ۰۰ء کو مولانا وحید الدین خان صاحب جامعہ تشریف لائے۔ آپ اپنے بڑے بھائی عبد العزیز خاں کے یہاں اعظم گڑھ تشریف لائے تھے۔ آپ نے طلبہ کی درخواست پر خطاب کرتے ہوئے فرمایا "میں اکثر سوچتا رہتا ہوں کہ موجودہ زمانے میں دوبارہ ایک نئی درسگاہ کی ضرورت ہے۔ میرا اپنا یہ خیال ہے کہ جس طرح ہر چیز کی عمر ہوتی ہے اسی طرح اداروں کی بھی عمر ہوتی

ہے ایک خاص کمی ہیں۔ تو جس طرح ایک جوان عمر، اسکے اندر جرأت بھی ہوتی ہے حوصلہ بھی ہوتا ہے۔ وہ کسی اور میں نہیں ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے دورِ جدید میں جو ایک نئی درسگاہ درکار ہے امت کے احیاء کے لئے، امت کے افراد کو تیار کرنے کے لئے شاید اللہ تعالیٰ اسی جامعہ سے کام لیں۔ کیونکہ جس رفتار سے یہاں ترقی ہو رہی ہے۔ اور خاص طور پر جس اتحاد اور جس اخلاص سے لوگ یہاں کام کر رہے ہیں اس میں میرے جیسے آدمی کے لئے بڑی امید ہے"

دوسالہ اجلاس عام شوریٰ انجمن طلبۂ قدیم منعقدہ ۱۱/۲/ فروری ۸۰ء نے یہ طے کیا کہ انجمن طلبۂ قدیم کا دوسالہ اجلاس عام انشاء اللہ ۱۲/۱۳/۱۴/ فروری ۸۰ء بروز جمعرات، جمعہ، سنیچر منعقد ہوگا۔ مولانا انصار احمد فلاحی ناظم اجلاس ہوں گے۔ مولانا عمران صاحب فلاحی، مولانا الٰہی صاحب فلاحی معاون ناظم اجلاس ہوں گے۔ پروگرام کا خاکہ مولانا انصار احمد فلاحی مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی کے تعاون سے تیار کر کے شوریٰ کے اگلے اجلاس میں پیش کریں گے جو انشاء اللہ نومبر ۸۰ء میں منعقد ہوگی۔

تعلیمی قرضہ انجمن کی شوریٰ نے طے کیا کہ مستحق فلاحی برادران کو اپنی اعلیٰ تعلیم جاری رکھنے کے لئے ایک سال کے لئے تعلیمی قرض دیا جائے گا۔ اس سلسلے میں صدر انجمن نسیم غازی سے رابطہ قائم کیا جائے اور متعلقہ فارم اور ضروری معلومات حاصل کی جائیں۔

بزم حیات نو جامعہ میں مقیم فلاحی برادران اور منتہی طلبہ کی ایک بزم مہمان خصوصی ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اور اس میں برادر فرید اعظمی نے عربی مقالہ پیش کیا جو بہت پسند کیا گیا۔ مولانا مطیع اللہ صاحب نے بھی ایک مقالہ پیش کیا۔ مولانا اس بزم کے نگراں بھی ہیں۔ یہ بزم انشاء اللہ ہر مہینہ منعقد ہوگی۔

تجوید کی تکمیل رضوان الحق گورکھپوری، محمد نعمان بستوی، محمد ادریس نیپالی، محمد سعد نیپالی، شمیم اختر سہرساوی، محی الدین سہرساوی، محمد عالم سعد راشد اور ذوالفقار علی نے مورخہ ۱۵ر مارچ ۸۰ء کو حدر کے ساتھ تجوید مکمل کی۔ تکمیل کے وقت متعدد اساتذۂ کرام موجود تھے تابش مہدی صاحب تجوید و قرأت کے استاد ہیں۔

الفلاح جمعیۃ الطلبہ کا سالانہ میگزین الفلاح طبع ہو کر آگیا ہے ۱۱۲ صفحات کا میگزین اپنے دامن میں اچھے مضامین سمیٹے ہوئے ہے۔